جمہوریت کی تاریک و مکروہ شکل:ایک مختصر نسل کش تحقیق

<u>The Dark side of democracy: Explaining Ethnic cleansing.</u>

<u>از</u>

مائیکل مان

ترجمہ : اکرم شریف

جامعہ کراچی دارُالتحقیق برائے علم و دانش

Karachi University research forum

کرف .:۲۰۱۷.©
۲۸۔جولائی ۔۲۰۱۷۔
اشاعتِ برقیہ :دویم ۔
جامعہ کراچی دارُالتحقیق برائے علم و دانش™
مونوگرافک:آرٹیکل:جمہوریت کی تاریک و مکروہ شکل
انگریزی آرٹیکل و تلخیص کتاب :

The Dark side of democracy: Explaining Ethnic cleansing.

اوردو ترجمہ :اکرم شریف۔
بشکریہ :ماہنامہ ساحل،سید خالد جامعی اور نیو لیفٹ ۔
کلید : جمہوریت،سماجیات،سیاست،مغرب،نو آبادیات،نسل کشی،قتل عام،جبریت ،لبرلازم،انفرادیت۔
پیشکش،فہرست،تہذیب :ڈاکٹر محمد علی جنید۔

www.facebook.com/kurf.ku
www.facebook.com/groups/kurfku
www.kurfku.blogspot.com

Karachi University Research Forum

جامعہ کراچی دارُالتحقیق برائے علم ود انش

+	**Section :Two:Summary Of Book :Chapter One** Michael Mann The Dark-Side of Democracy: Explaining Ethnic Cleansing	
3	**Chapter 1: The Argument**	1
15	**Concepts: Ethnicity, Nation, Ethnic Cleansing**	2
16,23	**TABLE 1.1**	3

جمہوریت اور نسل کشی میں فطری تعلق: ایک تحقیقی جائزہ

جمہوریت کے سنہری دور میں چھ کروڑ انسانوں کو قتل کیا گیا

نسلی اور سیاسی قتلِ عام کا جدید انداز

تحریر: مائیکل مین ☆

ترجمہ: اکرم شریف

بیسویں صدی میں نسل کشی کے نتیجے میں چھ کروڑ سے زیادہ افراد کا قتل عام ہوا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اس کے باوجود اس موضوع کی بجائے دوسرے خوش کن موضوعات اہل علم اور عام افراد کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ اگر یہ لوگ نسل کشی سے متعلق کچھ سوچنے کی زحمت گوارا کر بھی لیں تو بھی ان کی دانست میں بیسویں صدی میں ہونے والی معاشی، سماجی اور سیاسی ترقی کے تعمیری رجحانات کے دوران ان واقعات کا ہونا ایک افسوس ناک امر ہے۔ ہلاکت خیز نسلی اور سیاسی تطہیر قدیم زمانے، بلکہ جدت مخالف زمانے کا منظر پیش کرتی ہے اور عیار اور خطرناک سیاست دانوں کے ہاتھوں میں کھیلنے والے پس ماندہ اور انتہا پسند گروہ یہ مکروہ کام سرانجام دے رہے ہیں۔ دوسروں کی ایذا پر خوش ہونے والوں، خوف ناک قسم کے سرب (یا کروشیائی) باشندوں یا ابتدائی زمانے کے Hutus یا Tutsis لوگوں کو مورد الزام ٹھہرایئے، کیوں کہ ان کے کرتوتوں کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔ تصویر کا ایک اور رخ بھی

☆ یہ مضمون لندن سے شائع ہونے والے رسالے New Left Review میں شائع ہو چکا ہے۔

ہے جس کا پس منظر اکثر مذہبی نوعیت کا ہوتا ہے کہ گناہ کرنا تو انسانوں کی عالمگیر عادت ہے، خواہ وہ مہذب ہوں یا غیر مہذب۔ یہ درست سہی لیکن گناہ تو صرف مخصوص حالات میں کیا جاتا ہے اور نسل کشی کے معاملے میں تو لگتا ہے کہ قدیم زمانوں میں بھی اس بہتات اور کثرت سے لوگوں کو قتل نہیں کیا جاتا ہوگا، جس طرح کہ جدید دور میں ہوتا ہے۔

نسل کشی : جدید جمہوری وریاستی حکمتِ عملی

بیسویں صدی میں نسل کشی اور قتل عام کے بدنام ترین واقعات آرمینیا، نازیوں کے آخری حل (Final Solution)، سٹالن کے نظریات، کمبوڈیا اور روانڈا، سے متعلق ہیں اور ان کا مطالعہ کرنے والے چھوٹے سے گروہ کی اکثریت نے دراصل اس بات پر توجہ دلائی ہے کہ خوف و دہشت نے جدید صورت اختیار کرلی ہے۔ لیوکوپر نے بالکل درست انداز میں نسل کشی کے مطالعے کی بنیاد رکھتے ہوئے لکھا تھا کہ کسی ایسے علاقے میں، جہاں دراصل بہت سی تہذیبیں جمع ہوئیں اور معاشی طور پر خوش حال اور مضبوط ہوگئیں، تو وہاں پر جدید ریاست کے اقتدار اعلیٰ کی اجارہ داری نے نسل کشی کرنے کی خواہش اور طاقت پیدا کردی تھی[۱]۔ راجر اسمتھ بڑے شدومد سے کہتا ہے کہ نسل کشی بالعموم ایک جدید ریاستی پالیسی کے تحت دانستہ طور پر کی جاتی رہی ہے[۲]۔ کچھ لوگوں کے مطابق اس جرم کا ارتکاب کرنے والوں کے پاس ٹیکنالوجی کا حصول، نسل کشی کا سبب بنا ہے۔ نت نئے ہتھیاروں، ذرائع آمدورفت اور انتظامی طاقت نے نوکرشاہانہ اور لاپرواہی کے انداز میں عوام کی قتل و غارت میں اضافہ کیا ہے[۳]۔ البتہ ہیلن فین کو ٹیکنالوجی کے ذرائع کے علاوہ جدید نظریاتی مقاصد میں بھی ایسا عنصر نظر آیا ہے جس کی بناء پر "بیسویں صدی" کی دانستہ نسل کشی کے شکار افراد کو ایک نئے نظام کے قیام کی خاطر ریاست کے منصوبوں کی تکمیل کے حصول کے لئے قتل کیا گیا تھا[۴]۔ اس خاتون کا اصرار جدید "عقائد" یا سیاسی ضابطوں، قوم، نسل اور طبقے کے تصورات کی نسل کش صلاحیت پر ہے۔

قومیت کے نام پر بدترین قتلِ عام

ایک وصف جو ان سب میں مشترک ہے، وہ ان کا یہ جواز پیش کرنا ہے کہ انہوں نے جو کچھ بھی کیا اور نسل کشی کا ارتکاب بھی کیا تو وہ محض "قوم کی خاطر" کیا ہے۔ اس اعتبار سے وہ بیسویں صدی کے

زیادہ اعتدال پسندانہ تصورات سے الگ نہیں ہیں کیونکہ یہ زمانہ حکومتوں کے انتظام میں عام لوگوں کی کسی حد تک مداخلت کا رہا ہے۔ گزشتہ آٹھ دہائیوں کے دوران جرمنی کی مختلف عدالتوں میں وائمر سے نازی، نازی سے کمیونسٹ DDR اور DDR سے وفاقی جمہوریہ جرمنی (FR Germany) تک کے دور کے مصنفین نے یہی حربہ استعمال کیا ہے کہ "عوام کی خاطر"۔ امریکی عدالتوں میں رائج پسندیدہ اصول یہ ہے:

"فلاں کا مقدمہ بخلاف عوام" 'عوام' کے نام پر قانونی جواز کا دعویٰ کر کے نسل کش حکومتیں ان تحاریک سے تعلق کا دعویٰ کرتی ہیں جنھیں عموماً ایچھی جدت پسندی مثلاً لبرلزم یا سماجی جمہوریت کا علم بردار سمجھا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جدید نسل کشی کو "جمہوریت کا سیاہ گھناؤنا چہرہ" کہا جا سکتا ہے۔"

یہ جائزہ غیر روایتی ہے۔ دورِ حاضر کے "جمہوری امن" کا غالب مکتبہ یہ اعلان کر چکا ہے کہ جمہوریتیں یقیناً سست رو ہیں، شاذ و نادر ہی جنگ کرنے پر آمادہ ہوتی ہیں اور دوسروں کی مخالف تو ہوتی ہی نہیں ہیں۔ یہ جمہوریتیں تو نسل کشی کی بالکل ضد ہیں۔

تمام مطلق العنان ریاستوں نے قتلِ عام کیوں نہیں کیا؟

نسل کشی کے مطالعے میں اس مکتبے کا بڑا نمائندہ روڈولف رمل (Rudolf Rummel) ہے[۵] جس کا دعویٰ ہے کہ ریاست جس قدر زیادہ بااختیار ہو گی، اس کے نسل کشی کا ارتکاب کرنے کے امکانات بھی اسی قدر زیادہ ہوتے ہیں۔ بیسویں صدی کے دوران رونما ہونے والے نسل کش واقعات کے اعداد و شمار دیکھتے ہوئے رمل اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ درحقیقت جمہوریتیں نسل کشی کی مرتکب نہیں ہوتیں۔ وہ چند ایسی مثالیں بھی پیش کرتا ہے جہاں جمہوریتوں کو نسل کشی کے لئے موردِ الزام ٹھہرایا گیا ہے، لیکن اس کا کہنا ہے کہ یہ سب کچھ دورانِ جنگ ہوا تھا جہاں بڑے پیمانے پر قتلِ عام خفیہ طور پر اور عوام کی رضامندی کے بغیر ہوا لہٰذا یہ استثنائی صورتیں ہیں جن سے اس اصول کی حیثیت پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ چھوٹے پیمانے پر ہونے والے قتل کے واقعات جیسے ویت نام کی جنگ کے دوران اور Mylie کے واقعات کے سامنے آنے پر امریکی جمہوریت کے تحت مقدمات چلا کر ان کی مذمت کی گئی۔ لیکن جمہوریتوں کے ہاتھوں قتلِ عام، جیسے ڈریسڈن (Dresden) اور ٹوکیو پر بمباری اور ویت نامی دیہات میں قتلِ عام کو بھی اس نے بہت تخفیف کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان پر ایٹمی یا نیپام بم گرانے کے

واقعات میں بھی رمل امتیاز کرنے میں ناکام رہا ہے- ظاہر ہے کہ ان معاملات میں فوجی نوعیت کی رازداری کا خیال رکھا گیا ہے، پھر بھی امریکی اور برطانوی حکومتوں نے اپنی دانست میں درست جمہوری آئینی عمل کے تحت یہ فیصلے کئے -علاوہ ازیں اختیار کے بل بوتے پرنسل کشی بھی جنگ کے زمانے ہی میں ہوئی اور اس کو انتہائی رازداری سے انجام دینے کی کوشش کی گئی- ہٹلر نے سارے قتل تقریباً جنگ کے زمانے ہی میں کرائے اور اس میں اتنی جرات نہیں تھی کہ ان واقعات کا سرعام اعلان کرتا - اسٹالن میں بھی ایسی ہمت موجود نہیں تھی لیکن رمل کے ''اصول'' میں اس سے بڑی استثنائی صورتیں موجود ہیں- سترہویں صدی سے ابتدائی بیسویں صدی تک نسل کشی کے بہت سے واقعات رونما ہوئے جب یورپی مہاجرین دوسرے ممالک میں آئینی حکومتوں کے تحت زندگی بسر کر رہے تھے -ان واقعات کے بیان میں رمل نے بہت اختصار سے کام لیا ہے اور مرنے والوں کی تعداد بہت بھونڈے انداز میں بہت کم بتائی ہے اور بے تکے انداز میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ''ممکن ہے'' حکومتیں ان واقعات کی ذمہ دار رہی ہوں- دراصل وہ ان کی وضاحت نہیں کر پایا ہے-وہ یہ بات بالکل ٹھیک طرح سے بیان نہیں کر سکا ہے کہ کوئی حکومت لوگوں کی اتنی کثیر تعداد کو کس وجہ سے مار ڈالنا چاہتی تھی -آخر، تاریخ میں قریب قریب تمام حکومتیں کلی اختیارات رکھتی تھیں لیکن قتل عام تو سب نے نہیں کیا- اگلی سطور میں میں نے یہ بحث کی ہے کہ جمہوریت اور نسل کشی میں ایک تعلق موجود ہے لیکن اسے جتنا رمل نے تسلیم کیا ہے، یہ اس سے زیادہ پر پیچ اور دو دھاری ہے-

انقلاب اور قتلِ عام کا فطری تعلق

''رابرٹ میلسن (Robert Melson) کسی انقلاب کے فوراً بعد ہونے والی لڑائیوں کو نسل کشی کا سبب بتاتا ہے-اس کے بقول انقلابات پرانی حکومتوں کی اداراتی اور اخلاقی بندشوں کی اہمیت کو کم کر دیتے ہیں جس سے زبردست اخلاقی خلا پیدا ہو جاتا ہے[٦]- ایک ''صاحب عقیدہ'' قوم کے نام پر معاشرے کی ہیئت کو بالکل بدل ڈالنے کی خاطر ہر طرف انقلابی لوگ پھیلا دیئے جاتے ہیں- پھر اس ''قوم'' کو ایسی وضاحتوں اور حدود کا تعین کرنے کی ضرورت پڑتی ہے جن کے سہارے مخالفین کو ممکنہ طور پر پرتشدد طریقوں سے ہٹایا جا سکے- اس کے بقول، جنگ سے حکومتوں کے احساس ضعف اور/یا طاقت میں اضافہ ہوتا ہے- جنگ ریاستوں کو مزید خود مختار رہونے میں مدد دیتی ہے-انہیں مزید ''انتہا

پسندانہ" پالیسی کے نعم البدل طریقے اختیار کرنے کی اجازت دیتی ہے اور ظلم کا شکار ہونے والوں کو مزید لاغر و کمزور کر ڈالتی ہے۔ یوں انقلاب اور جنگ کا باہمی ملاپ حکومت کو یہ ماننے پر آمادہ کر دیتا ہے کہ مقامی مخالفین کا بدترین غیر ملکی دشمنوں کے ساتھ گٹھ جوڑ ہے اور ان کا قتل قانوناً جائز ہے۔ لیکن میلسن یہ کہنے میں محتاط ہے کہ لازمی نہیں کہ ایسا کچھ واقعی ہو بھی جائے۔ مثال کے طور پر کیوبا میں انقلاب اور جنگ کے بعد بورژوا طبقے کو ملک سے نکالنے پر اکتفا کیا گیا، ان کا قتل عام نہیں کیا گیا۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ انگریزی، امریکی اور فرانسیسی انقلابات میں، اپنے بعد میں ہونے والے انقلابات کے مقابلے میں نسل کشی کے امکانات کم تھے۔ اگرچہ وہ اس بات کو ٹھیک طور پر واضح نہیں کر پایا ہے۔ آخری بات یہ کہ اس نے اس امر پر توجہ نہیں دی کہ کسی قوم کے نظریات، نسل اور طبقے کا ارتقا، جنھیں نسل کشی کا جواز بنایا جاتا تھا، انقلاب یا جنگ کے عنصر کے ساتھ یا اس کے بغیر جدید زمانوں میں بھی ظاہر ہوئے ہیں۔

رل اور خصوصاً میلسن نے، ہمارے سامنے اندرونی صورتِ حال پیش کی ہے لیکن اسکی نوعیت بالعموم سطحی ہے۔ اگر ہمیں منطقی طور پر جائز قرار دی گئی اور ریاست کے ہاتھوں ہونے والی نسل کشی کے فروغ کو سمجھنا ہو تو ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ سب مغربی جدیدیت کے مقدس ترین اداروں کے بدترین کارنامے ہیں؛ کیوں کہ نسل کشی کو نمایاں طور پر دو مختلف پہلوؤں سے دیکھا جا سکتا ہے، جیسے جمہوریت کا سیاہ گھناؤنا چہرہ، لوگوں کو سیاسی جواز دینے کی جدید روایت کا انتہائی ناپسندیدہ انجام۔

امریکی لوگوں کا دنیا بھر میں اثر و رسوخ

"آیئے لوگوں کے سب سے پہلے اعلانات میں سے ایک اہم اعلان کی روشنی میں لوگوں سے ملتے ہیں:

ہم ریاست ہائے متحدہ کے لوگ، ایک مکمل تر اتحاد کی تشکیل کی خاطر، انصاف قائم کرتے ہیں، اندرونی سکون و امن کا یقین دلاتے ہیں، مشترکہ دفاع فراہم کرتے ہیں، بہبودِ عامہ کو فروغ دیتے ہیں اور اپنے لیے اور اپنی نسلوں کے لیے آزادی کی نعمتیں حاصل کرتے ہیں اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے لیے یہ آئین مقرر اور قائم کرتے ہیں۔"

امریکی آئین میں بیان کیے گئے "لوگوں" کا دنیا بھر میں بہت اثر و رسوخ ہے۔ اب تو اس نے ساری جدید ریاستوں کو جائز قرار دے دیا ہے۔ اور غیر مشروط طور پر اور عالمگیر سطح پر اس کو اچھی اور

اخلاقی اجتماعیت کے طور پر دیکھا جاتا ہے ۔لیکن اگر کسی مخصوص علاقے کے عوام کو اقتدار اور اخلاقی جواز سونپ دیا جائے تو دو مسائل کا سامنا ہو سکتا ہے، پہلا یہ کہ شہری انجمن کو واضح اور عمدہ رویوں میں، خواہ وہ فرقہ وارانہ اور یا سیاسی ہوں، شریک تصور کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے یہ ایسے غیر شہری باشندوں اور پڑوسیوں سے الگ تھلگ نظر آتا ہے جو شہریت کے حق دار نہیں سمجھے جاتے ہیں ۔ 'ہم لوگوں' کے اعلان سے پرائے ''غیروں'' کا احساس اُبھرتا ہے ۔دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اگر اقتدار کو بھی کسی خاص علاقے سے منسوب کیا جائے، جو کہ ریاستوں کا عام وصف ہے تو لوگوں کے علاقے سے ''غیروں'' کو طبعی طور پر باہر نکالا جا سکتا ہے ۔

البتہ ایسے ممکنہ معانی اخذ کرنے میں دو باتوں میں فرق کا خیال رکھنا ضروری ہے ۔اول یہ کہ میں واضح طور پر دو مختلف ''لوگوں'' کو دیکھ سکتا ہوں جو جمہوری روایتوں پر بہت مضبوطی سے کاربند ہیں ،ایک وہ لوگ جہاں گروہ مختلف درجوں میں بٹے ہوئے ہیں اور دوسرے منظم طور پر رہنے والے لوگ ۔جبکہ دونوں قسم کے لوگ، 'غیر ملکیوں' کو غیر سمجھنے کا رجحان رکھتے ہیں بلکہ منظم (organic) لوگ تو بہت سے ایسے لوگوں کو باہر نکال سکتے ہیں جنھیں بصورت دیگر شہری تصور کیا جا سکتا ہے ۔اگر لوگوں یا قوم کو اندرونی طور پر درجوں میں بٹا ہوا سمجھا جائے تو پھر ریاست کی بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس مسابقت میں شامل مفاد حاصل کرنے والے گروہوں میں درمیانی واسطہ بن کر ان میں مفاہمت پیدا کرے ۔ایسی ریاست اپنے شہریوں کے مابین مختلف خصوصیات کو تحفظ دیتی ہے اور اسی وجہ سے وہ ان کے بیچ فرقہ وارانہ اور سیاسی نسل کشی کی حوصلہ افزائی پر مائل نہیں ہوتی ۔لیکن اگر لوگوں یا قوم کو منظم تصور کیا جائے یعنی ایک مکمل وحدت ۔ بالکل یکجا اور ناقابلِ افتراق' (جیسا کہ امریکی مسلک میں ہے) تو پھر لیڈروں اور تحریکوں کو شہ مل سکتی ہے کہ اپنے ارکان کے ظاہری اصل فرق کو کچل کر منظم (organic) لوگوں یا قوم کی خالصیت' میں اضافہ کر دیں ۔بلاشبہ بہت سی جدید ریاستوں نے، جو اپنے جمہوری ہونے کا ڈھنڈورا پیٹتی ہیں، فرقہ وارانہ اور سیاسی نسل کشی کے اعلانیہ رجحان کا اظہار کیا ہے ۔

مختلف گروہوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے تین جدید حربے

ان میں سے دوسرا فرق یہ ہے کہ ہمیں 'تطہیر (نسل کشی)' کی مختلف اقسام اور درجات میں امتیاز کرنا چاہئے ۔یہ بات ہمیں صراحت سے کہنی چاہئے کہ ان میں سے اکثر اقسام نسل کشی کی جانب نہیں

لے جائیں۔ خفیف تشدد کے ساتھ تطہیر سب سے زیادہ کارگر رہی ہے۔ تطہیر کی یہ تین قسمیں ہیں: جبری انجذاب، جبری آبادکاری اور جبری ترکِ وطن۔ ان سب میں ظلم واستبداد کا عنصر زیادہ نمایاں نہیں ہے۔ جبری انجذاب میں 'غیر' اپنی مرضی کے برعکس غالب گروہوں میں ضم کیے جاتے ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں آبادکار گروہوں کی تطہیر کا ایک مخصوص انداز رہا ہے: جب وہ معاشی کامیابی اور سماجی موافقت کے پیچھے لگ گئے اور امریکی بن گئے، تو انہوں نے اپنی معاشرتی وتہذیبی پہچان کا احساس بہت حد تک کھودیا۔ تطہیر کی یہ ایک ایسی کم ضرر رساں شکل ہے جس پر صرف وہی لوگ ماتمِ افسوس کرتے ہیں جو روایتی ثقافتوں کے تحفظ کی اہمیت سے آگاہی رکھتے ہیں۔ جبری آبادکاری کی اسکیمیں بھی عموماً ثقافتی طور پر یکسانیت رکھنے والی میزبان آبادی کو فوائد پیش کرتی ہیں، جبکہ اسی کے ساتھ ساتھ وہ اپنے سے "غیروں" کو کچھ نہیں دیتیں جس کی مثال ماضی قریب کی "سفید فام آسٹریلیا" کی آبادکاری کی پالیسی ہے۔ جبر کی تیسری صورت یعنی ترکِ وطن پر روایتی قوم پرستوں نے اکثر زور دیا ہے، جیسے حالیہ نیشنل فرنٹ جماعتیں لیکن انکی باتوں پر عمل نہیں کیا جاتا اور اگر ان پر عمل درآمد ہوجائے تو ان میں جبر کی جھلک نظر آنے لگتی ہے۔

تطہیر میں پہلی تیزی جبری انجذاب کے عمل میں آتی ہے۔ اس معاملے میں 'غیروں' کو منظم طور پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ غالب گروہ کے ساتھ شامل ہوجائیں اور اپنی سابقہ پہچان کو ترک کردیں۔ اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ ان "غیروں کی زبان پر اسکول اور دفتروں میں پابندی لگادی جائے، ان کے مذہب پر قدغن لگ جائے اور ان کے مخصوص خاندانی نام زبردستی تبدیل کردیے جائیں۔ اگرچہ یہ بہت ناخوشگوار بات ہے لیکن اس میں جسمانی جبر بہت کم ہے اور ریاست بدری یا قتل کی نوبت نہیں آتی۔ اوسط درجے کا تشدد کرنے کی ایک منفرد صورت، جسے صرف چھوٹے 'غیروں' پر استعمال کیا جاتا ہے، وہ حیاتیاتی انجذاب ہے: شادی بیاہ کے سخت قوانین اور انتہائی صورت میں sterilization کے ذریعے اقلیت کو پھیلنے سے روکا جاتا ہے۔ یقیناً مظلوم گروہ ایسے دباؤ پر ردعمل کے طور پر باہر نکلنے کا اختیار استعمال کرتے ہوئے ترکِ وطن اختیار کرسکتے ہیں جس سے بھی تطہیر کے عمل کو تقویت ملتی ہے۔ تطہیر میں اگلی تیزی علاقے سے باہر نکلنے کا 'جبری ترکِ وطن' کا صریح عمل ہے، یعنی غیروں کا اقتدار کے علاقے سے بزور طاقت نکالے جانا۔ اس میں جسمانی خوف وہراس، جائداد کا غصب کرلینا وغیرہ شامل ہیں، اور اس طرح، اپنی موجودہ جائے مسکن میں مزید ٹھہرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ تیزی کا اگلا سبب ملک بدری ہے جو منظم طور پر اور

طاقت کے ذریعے ریاست کے علاقوں سے نکالنے کے لیے عمل میں لائی جاتی ہے ۔اس کے بعد تطہیر بذریعہ قتل آتی ہے جس میں قتل کا عمل منظم طریقے سے کیا جاتا ہے ۔اس سے بھی جبری ترک وطن کی نوبت آسکتی ہے، لیکن بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ قتل کے نتیجے میں آخری حد، یعنی مخصوص آبادی کا صفایا کرنے کی دانستہ اور منظم کوشش یعنی نسل کشی کی نوبت آئے ۔گذشتہ صدی سے قبل نسل کشی کے واقعات بہت کم ہوئے ہیں۔

یہ امتیازات یقیناً بہت زبردست تصورات ہیں ۔اصل غیروں پر زیادہ تر دباؤ ملے جلے رہے ہیں مثلاً یہودیوں کے خلاف منظم طور پر چلائی گئی قتل عام کی مہم میں خاص طور پر تشدد، لوٹ مار اور عصمت دری کا عنصر بہت زیادہ شامل تھا؛ بعض نے مذہب بدلنے پر مجبور کیا لیکن قتل کم ہی کیا ۔اکثر ارتکاب کرنے والے (جنھیں بلاشبہ سیاسی حکمرانوں کی پشت پناہی حاصل تھی) یہودیوں کا مکمل طور پر انخلا نہیں چاہتے تھے ۔کیوں کہ یہودیوں سے بہت سے مفادات حاصل ہو سکتے تھے ۔اس کے باوجود غیر یقینی فسادات کی صورت میں تطہیر کا عمل جاری ہے، اور پھر یہ فسادات ختم ہو جاتے ہیں یا شدید ردعمل کا باعث بنتے ہیں۔ خوش قسمتی سے نسل کشی اس قسم کے مراحل کا لازمی نتیجہ بالکل نہیں ہوتی ۔انجام کار، ایسی پالیسیاں زیادہ تر خصوصاً فرقہ پرست گروہوں کو نشانہ بناتی ہیں، اگرچہ وہ مذہبی گروہوں یا سیاسی گروہوں کے خلاف بھی ہو سکتی ہیں ۔سیاسی تطہیر عموماً سب سے نرم ہوتی ہے، جب کہ فرقہ وارانہ تطہیر سخت ترین رہی ہے ۔اس لیے آیئے جدید تطہیر کی بڑی صورتوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

آزاد خیال جمہوریت اور اس کا تاریک پہلو

آزاد خیال نظریہ (لبرل ازم) کے اصول عام طور پر بورژوائی انفرادیت پسندی پر زور دیتے ہیں ۔کہا جاتا ہے کہ آزاد خیال جمہوریتیں امن پسند ہوتی ہیں کیوں کہ آزاد منش آئین کی اولین ترجیح انفرادی انسانی حقوق کا تحفظ کرنا ہوتا ہے ۔گروہوں کے مقابلے میں، الگ تھلگ افراد کی کمی کو، خصوصاً معاشرتی طبقوں میں، لبرل ازم کے اہم ترین عنصر کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ معاملہ ذرا مختلف نوعیت کا لگتا ہے ۔میرا موقف یہ ہے کہ طبقاتی جدوجہد اور اس کے باقاعدہ طور پر منظم ہونے کے عمل نے انفرادی انسانی حقوق کے لیے لازمی احترام سے کہیں زیادہ اکثر آزاد خیال جمہوریتوں کو ان کے اصل شہریوں کے درمیان تطہیری قتل کو روکا ہے ۔تاہم آزاد خیال جمہوریتوں نے بڑے پیمانے پر تطہیر کی ہے، جو

کبھی نسل کشی کی حد تک بھی جا پہنچی ۔خصوصاً نوآبادیوں کے معاملے میں جہاں بڑے معاشرتی گروہوں کے بارے میں یہ قرار دیا گیا کہ ان کا تعلق ''لوگوں'' سے نہیں ہے ۔آیئے دونوں قسم کی آزادمنش صورتوں پر باری باری نظر ڈالتے ہیں۔

امریکی آئین بنانے والے کون تھے؟

یہ تو ظاہری بات ہے کہ ''لوگوں'' نے امریکی آئین حقیقتاً مقرر اور قائم نہیں کیا۔ یہ کام تو پچپن برس کے اوسط عمر کے حامل ان افراد نے کیا جو اعلیٰ عہدوں اور حیثیتوں کے مالک تھے اور انہوں نے فلاڈیلفیا میں دو ہفتے تک قیام کیا ۔انہیں تیرہ نوآبادیوں کے ''لوگوں'' کی نمائندگی کا دعویٰ تھا۔ سوال یہ ہے کہ درحقیقت وہ ''ہم لوگ تھے کون؟ ان بانی بزرگوں نے خواتین، غلاموں اور مقامی امریکیوں کو ان ''لوگوں'' میں شامل نہیں کیا تھا ۔ان بزرگوں میں سے اکثر نے ،بغیر دولت و جائیداد والے یعنی ادنیٰ طبقوں کے سفید فام مردوں کو بھی عام لوگ قرار دے دیا ۔اس دور کے برطانوی سیاست دانوں نے لوگوں اور عام لوگوں میں واضح فرق ظاہر کیا۔ 'عام لوگوں' کا مطلب تھا ادنیٰ لوگ ہجوم، بے ہنگم مجمعے، جو یقینی طور پر اہم لوگوں کا حصہ نہیں تھے۔ ''ہم'' میں وہ اہلِ ثروت و جائیداد افراد شامل تھے جنہیں 'مفید' سمجھا گیا تھا یعنی شرفاء، تاجر، صنعتکار، ہنرمند افراد وغیرہ۔ یہ تسلیم کیا گیا کہ یہ مفید افراد' قابلِ تقسیم ہیں، اگرچہ جائیداد اور تعلیم کے حامل یہ افراد بھی 'قوم میں مشترکہ طور پر' حصہ دار تھے ۔اس طرح شہری ادارے کی تنظیم نو ایسے طریقے سے ہوئی کہ وہ اندرونی طور پر درجات میں بٹی ہوئی تھی اور ایسے ادنیٰ طبقے سے بالاتر ہو کر وجود رکھتی تھی جو شہریت کے تمام تو نہیں لیکن کچھ حقوق ضرور رکھتا تھا۔

دو طریقے ایسے تھے جن سے یہ درجہ بندی 'ہم لوگوں' کی 'غیروں' کے لئے نفرت میں مانع تھی اور دونوں نے پہلے دور کی ان پرانی حکومتوں کی، جو صرف خود ساختہ حکمرانوں اور مراعات یافتہ طبقوں پر مشتمل تھی، لگائی ہوئی پابندیوں کی روایت کو جاری رکھا۔ پہلا طریقہ آزاد خیال جمہوریت کو مزید وسعت دینا ہے، 'ہم لوگوں' میں اضافہ کرتا ہے جو طبقاتی رشتوں کی بدولت غالب تھے، اور اس بات سے سیاسی عمل کار پہلے ہی سے بہت اچھی طرح واقف تھے، حقِ شہریت میں اضافہ ہونے والے مباحث میں پرانے مسائل حاوی تھے۔ جائیداد کی کیا حد مقرر کی جائے؟ کیا ملازمین اور نوکروں کو، جو اپنے طور پر فیصلہ کرنے کے اہل نہ ہوں، ووٹ ڈالنے، منصف بننے یا عہدے رکھنے کا حق حاصل ہونا چاہئے؟ کیا کچھ طبقوں کو

دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ووٹ کا حق حاصل ہونا چاہئے؟ جیسا کہ شہری ادارے میں یہ بات پہلے ہی موجود تھی، اس کو تسلیم کرلیا گیا کہ ان اجتماعی طبقات اور درجہ بندی پر مبنی مفادات سے مصالحت تو کی جا سکتی ہے لیکن ان کا انخلا ممکن نہیں ہے۔ "لوگ" کوئی واحد اور ناقابل تقسیم وجود نہیں بلکہ کثیر الوجود ہیں اور درجات رکھتے ہیں۔ اس طرح سے آزاد منش جمہوریت کی سیاسی بنیاد مسابقت کرنے والے گروہی مفادات کی قانونی حیثیت کو مان لینے کے مقابلے میں کم انفرادیت پسند ہے۔ کسی جماعتی نظام میں تو یہ با قاعدہ طور پر منظم رہتے ہیں؛ ان سے تجاوز کرنا، ان پر حاوی ہونا، اور ان کی تطہیر کرنا ممکن نہیں ہے۔ اب چوں کہ سیاست کا بڑا کام ہی مفادات کے مابین مصالحتی واسطے کا ہے، لہٰذا ایسی ریاست ایک محدود ریاست ہوتی ہے اور اپنے کچھ اختیارات ہی استعمال کر پاتی ہے۔

جدید معاشرے اور طبقاتی تنازعات

جلد ہی آزاد خیال حکومتوں میں طبقے کے ساتھ ساتھ عمر اور تذکیر و تانیث کے معاملے نے بھی مرکزی مسئلے کی شکل اختیار کرلی ہے۔ آیا گھر کے سربراہ ہی کو پورے حقوق حاصل ہونے چاہئیں، یہ کہ گھر میں موجود دوسرے مرد کس عمر میں خود مختار سوچ کے حامل کہلائیں گے؟ تذکیر و تانیث کا معاملہ بڑا معلوم ہوتا تھا، اور عمر اور طبقے کی بنا پر یہ الجھتا گیا۔ اس طرح کہ ایک مخصوص عمر یا طبقے کی عورت دوسری عورتوں کے لئے سیاسی طور پر ذمہ دار سمجھی جا سکے۔ اس سے پابندی کا دوسرا جواز بنتا ہے۔ طبقہ، عمر اور جنس سب ہی درجوں میں بٹے ہوئے ہیں لیکن اس سے لوگ مختلف برادریوں میں عموماً تقسیم نہیں ہوا کرتے البتہ یہ ضروری ہے کہ یہ گروہ آپس میں مل جل کر رہیں اور کام کریں۔ یہاں تک کہ شدید طبقاتی تنازعات کے دوران بھی، کارکنوں اور آجر دونوں ہی ضرورت پڑنے پر ایک دوسرے کے معاون رہے ہیں۔ مختلف عمروں کے لوگ، مرد و خواتین بھی مل کر رہتے ہیں اور خاندان بناتے ہیں۔ اگرچہ مختلف طبقات کے لوگ ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہ سکتے ہیں، تاہم وُہ عام طور پر ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں۔ ایک دوسرے پر یہی انحصار "ہم لوگوں" اور "غیروں" کے درمیان سخت ترین نفرت میں مانع رہتا ہے۔

جدید معاشروں کی ترقی میں طبقاتی تنازعات ہمیشہ اہم رہے ہیں۔ اسی کی وجہ سے آزاد خیال اور سماجی جمہوریتی ادارے وجود میں آئے ہیں۔ یہی بات عمر اور جنس کے مسئلے پر بھی صادق آتی ہے۔ یہ سب گروہ ان لوگوں کے اندر ہی مسابقت کے حامل مفادات کے طور پر موجود رہتے ہیں جن کے ایسے

تنازعات کو جائز مانا جاتا ہے جو آزاد خیال سماجی جمہوریت کے کثیر الجماعتی نظام ہائے حکومت میں با قاعدہ اداروں کے طور پر موجود ہوتے ہیں۔ درجات تو آزاد خیال اور سماجی جمہوریت کا خاصہ ہوتے ہیں۔ چوں کہ جمہوریت کی اس صورت میں استحصال کی نت نئی صورتوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے وہ مستقل طور پر خود کو تیار رکھتے ہیں لیکن اپنے مخالفین کو زمین سے ہٹا کر تطہیر کر دینے سے، آزاد خیال اداروں کے درمیان جھگڑا نہیں ہوتا۔ لیکن اس صورت میں قتل عام کم ہوتا ہے۔ لہٰذا، اگر چہ سرمایہ دارانہ نظام اپنے اندر خاص شفقت نہیں رکھتا، پھر بھی اس سے پیدا ہونے والی طبقاتی مزاحمت آزاد خیال مفاہمت کی فضا قائم کرنے کا رجحان رکھتی ہے۔

آزاد خیال ریاستوں میں طبقے اور جنس کے تنازعے کا مطلب یورپ میں فرقہ واریت ہے۔ لسانی طبقات یا فرضی نسلی طبقات نے ابتدائی سیاست میں کوئی خاص کردار ادا نہیں کیا تھا، برطانیہ میں سب صاحبِ جائیداد افراد شہری متصور ہوتے تھے خواہ وہ انگریزی، سیلٹک (Celtic) یا گیلک (Gaelic) (جو اکثریت کی زبان تھی) بولتے ہوں۔ مذہب جو کہ درجہ بندی کا پرانا محور رہا ہے، اہمیت کا حامل رہا۔ خصوصاً، یورپ کی واحد اندرونی نوآبادی آئرلینڈ جہاں 'غیر مہذب' کیتھلک ''غیروں'' کے خلاف ''پروٹسٹنٹ آئین'' تک بات پہنچی جس کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر قتلِ عام ہوا۔ لیکن بیسویں صدی شروع ہونے تک، یورپ میں اکثر غالب فرقے، بلکہ مذہبی گروہ تک، یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ ان ''غیروں'' کو اپنا حصہ بنالیں۔ اس میں منظم ظلم و جبر کا عنصر کسی حد تک شامل ہو سکتا تھا، بالخصوص اقلیتوں کی زبانیں ختم کرنے کے لئے لیکن ان ''غیروں'' کو باہر نہیں نکالا گیا اور نہ ہی وہ قتل بھی نہیں ہوئے۔ انہیں برطانوی یا فرانسیسی یا جرمن بننے کی اجازت حاصل تھی [۷]۔

یورپ ---- تسلط اور آزاد خیالی

یورپ میں آزاد خیال ریاستوں نے صرف اپنے شمال مغرب یعنی نارڈک ممالک، زیریں ممالک جیسے، فرانس، سوئٹزرلینڈ اور برطانوی جزیروں پر تسلط قائم کیا، جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، یورپ کے باقی نصف علاقے آزاد خیالی کی جانب اتنی آسانی سے راغب نہ ہو سکے۔ خصوصاً آبادکاروں کی نوآبادیوں میں، تنظیمی نوعیت کی وجہ سے ''لوگوں'' کا تصور سرایت کر گیا۔ اگر چہ مانا گیا کہ اس کے بہت فائدے ہیں، لیکن ایک معاملے میں لوگوں کو منظم ضرور سمجھا جاتا تھا: یہ یقینی طور پر 'یورپی' تھے جو غیر نسلوں

سے برتر تھے گو کہ خود یورپی لوگوں میں یہ "غیر" بھی جزوی طور پر موجود تھے۔لہٰذا کچھ ریاستیں جنھیں آزاد خیال کہنا شروع کر دیا گیا، دراصل دو پہلو رکھتی تھیں۔ان کا ایک رخ تاریک تھا۔سرمایہ دار طبقے سے مفاہمت، آزاد خیال جمہوریت اور یورپ کے آباد کاروں میں تحمل و برداشت کی خاطر مقامی غیروں کے خلاف ہولناک خوں ریزی کی گئی.... چوں کی یہ اعلیٰ لوگوں کی جمہوریت تھی۔بدترین واقعات وہاں نظر آتے جہاں نوآبادیات میں پورے کے پورے خاندان شامل تھے۔انہیں مقامی لوگوں سے کاروبار کرنے یا ان کی محنت کا استحصال کرنے سے زیادہ ان کی زمینیں ہتھیانے کی فکر تھی۔ایسے آباد کار خاندانوں کو مقامی لوگوں سے نہ تو اولادیں پیدا کرنا تھیں اور نہ باہمی شادی بیاہ کے تعلقات جوڑنا تھے۔اسی وجہ سے وُہ ان مقامی لوگوں کو نسلاً "غیر" سمجھنے لگے اور قتل سمیت کسی بھی طریقے سے باہر نکالنا چاہتے تھے۔اس عمل میں اکثر ظالمانہ ملک بدری ہوتی تھی، اور کبھی کبھار اس دوران دانستہ نسل کشی کے واقعات جنم لیتے تھے۔جابرانہ غلامی کا طریقہ دراصل ایک نسبتاً نرم نعم البدل تھا: یہاں "کم تر" گروہ کو درحقیقت ہٹایا نہیں جاتا تھا بلکہ اس کا استحصال کر کے یورپیوں کے آزاد منش اداروں سے علیحدہ کر کے خارج کر دیا جاتا۔

آباد کار اور ان کے شکار

نوآبادی کے تاریک رخ کے دو اہم پہلوؤں پر میری توجہ مبذول ہوئی ہے۔پہلا یہ کہ، آباد کار اس جگہ خود حکمرانی کر رہے تھے جہاں آئین اجازت دیتا تھا۔ایک عرصہ تک ایسی حکومتیں واضح طور پر جمہوری معاشرتیں تھیں، پھر بھی مقامی لوگوں کی جو تطہیر انہوں نے کی، وُہ عموماً اس تطہیر کے مقابلے میں بدتر تھی جس کا نوآبادی کے کم جمہوری بادشاہی حکام ارتکاب کرتے تھے۔اہلِ ہسپانیہ، اہلِ پرتگال اور برطانوی بادشاہ، وائسرائے اور گورنرز، اور کیتھلک کے علاوہ کچھ پروٹسٹنٹ گرجے مقامی لوگوں کے لئے آباد کاروں کی نسبت زیادہ نرم رویہ رکھتے تھے۔یہی وجہ تھی کہ امریکہ کی انقلابی جنگ میں بیشتر ہندوستانیوں (Indians) نے برطانویوں کا ساتھ دیا۔دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہسپانیہ یا پرتگال کے آباد کاروں کے مقابلے میں برطانوی آباد کاروں میں نسل کش فسادات زیادہ عام ہوتے تھے۔دونوں صورتوں میں، یہ نظر آیا ہے کہ ارتکاب کرنے والوں میں جمہوریت جتنی زیادہ طاقتور ہوتی تھی نسل کشی بھی اسی قدر زیادہ کی جاتی تھی۔

لبرل جمہوریتیں اور نسل کُشی کا بار بار ارتکاب

لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ مقامی لوگوں کے اپنے سیاسی ادارے، آباد کاروں کے اداروں کے مقابلے میں عموماً کہیں زیادہ جمہوریت پسند تھے ۔ سیاسی معاملات میں ان کی شمولیت مقامی نمائندوں کی بہ نسبت زیادہ براہ راست تھی۔ لیکن مقامی قبائل اور قوموں کے عام مرد ارکان کے حقوق، بلکہ کبھی کبھار عورتوں کے بھی، نمائندہ لبرل جمہوریتوں کے شہریوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوتے تھے ۔ مثلاً وہ اپنے قبیلے یا قوم کو آزادانہ طور پر چھوڑ سکتے تھے یا اس کی خاطر لڑنے سے انکار کر سکتے تھے ۔ جمہوری امن'' کے مکتبے نے اپنے اعداد وشمار میں سے ہندوستانی قوموں جیسے گروہوں کو خارج کر دیا ہے، جس کی ممکنہ وجہ یہ ہے کہ ان کی 'جدید' قسم کی مستقل، منفرد ریاستیں نہیں تھیں ۔ خودستائی میں ان کی تحاریر کی تائید کرنا بہت آسان ہے، لیکن اصل معاملہ خود ان کے بیان کردہ معانی کے اعتبار سے بھی ناجائز ہے ۔ کیوں کہ ہندوستانی قومیں انیسویں صدی کے وسط کے دوران ہی آئینی ریاستیں قائم کر چکی تھیں ۔ مثلاً ۱۸۲۷ میں شیروکی Cherokee اور ۱۸۵۶ سے ۱۸۶۷ کے دوران شوکٹا (Choctaw) چکاسا (Chikasaw) اور کریکس (Creeks) کی ریاستیں ۔ اس کی ایک وجہ متحدہ امریکہ کی جانب سے یہ دباؤ بھی تھا کہ ایسی ''ذمہ دار'' حکومت بنائی جائے جس سے وہ سودے بازی کر سکیں [۸] ۔ جیسا کہ پہلے ہی سے اندازہ تھا، یہ سودابازی ایسے مکمل غصب اور ملک بدری پر منتج ہوئی جس میں نسل کش فسادات کا عنصر بھی شامل تھا ۔ یوں لبرل جمہوریتیں دوسری جمہوریتوں کے خلاف بار بار نسل کشی کا ارتکاب کر رہی تھیں ۔ اگر ہم یہ اندازہ کرنے بیٹھ جائیں کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ، کینیڈا اور آسٹریلیا نے علیحدہ علیحدہ، ہندوستانی اور اصل امریکی باشندوں (Aboriginals) کے خلاف انفرادی سطح پر کس قدر قتل عام کیا ہے تو ہم رمل Rummel کے اعداد و شمار کی مدد سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اطاعت شعار نظام کی متقاضی حکومتوں کے مقابلے میں جمہوری حکومتوں میں نسل کشی کا رجحان زیادہ تھا ۔ لیکن مجھے اعداد وشمار کی جادوگری کی مخالفت میں دلچسپی نہیں ہے ۔ بس ایک چھوٹی سی عمرانی حقیقت بیان کرتا ہوں: کہ نو آبادیوں کے ''دوغلے'' معاشروں کی آباد کار جمہوریتوں میں دوسری جمہوریتوں کے خلاف بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ تطہیر کے امکانات زیادہ پائے جاتے ہیں اور کبھی کبھی یہ نسل کشی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں ۔

کیا یہ لبرل جمہوریت کے دونوں پہلوؤں ۔ خالص جمہوریت اور نسل کشی ۔ کے درمیان یقینی تعلق تھا؟ ایک معاملے میں یہ بہر حال یقینی نہیں تھا ۔ شمال مغربی یورپ کی سرزمین میں لبرل جمہوری

حکومتوں کا وجود، نوآبادیاتی علاقوں میں نسل کشی کی وجہ سے عمل میں نہیں آیا تھا۔ بلکہ یہ خود یورپ کے اندر ہی سے مقامی طور پر سامنے آئی تھیں۔ہم دو مختلف قسم کے امور پر بحث کر رہے ہیں۔لیکن ان کے علاوہ ایک تیسرا تعلق بھی موجود تھا۔چوں کہ شاہی حکام خصوصاً ہسپانیہ اور پرتگال کے حکمران، "عوام کی" حکومت کے قائل نہیں تھے، اس لیے ان سے اس بات کی زیادہ توقع نہیں تھی کہ وہ ایسے نظریات کو فروغ دیں گے جو تمام آبادکاروں کی نسلی (یا غیر) عمومیت کو اہمیت دیتے ہوں۔تاہم، چوں کہ آبادکار، حکومت میں "لوگوں" کی جائز شرکت کے متمنی تھے، جبکہ لوگوں سے ان کی مراد صرف یورپ ہی کے لوگ تھے تو لگتا تھا کہ وہ "لوگوں" کے نظریے کو "نسل" کی حیثیت سے فروغ دیں گے۔یہ پہلا مطلب ہے کہ جس کے مطابق نسل کشی جمہوریت کا ایک سیاہ رُخ تھی۔

یہ سب کچھ رمل (Rummel) کے کم از کم جدید زمانے میں، نسل کشی کی "جمہوری سلامتی کے معنوں میں وضاحت سے بالکل برعکس ثابت ہوتا ہے۔کیا امریکہ اور آسٹریلیا کو لبرل جمہوریتیں اور ایسی ریاستیں سمجھا جا سکتا تھا جنھوں نے صرف یورپیوں اور بہت سے بچ جانے والے مقامی لوگوں کی اولادوں کو قتل نہیں کرایا؟ جدید دنیا کی لبرل جدت پسندی کے لیے فرقہ وارانہ تطہیر، قتل سے بھرپور ریاست بدری اور بدترین شکل میں نسل کشی، مرکزی اہمیت رکھتی تھی، جس کا ارتکاب پہلے آبادکاروں کی نوآبادیوں نے کیا اور پھر "پہلی نئی دنیا نے"۔یہ عمل شمالی امریکہ اور آسٹریلیا میں اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ مارڈالنے کے لیے کوئی مقامی لوگ دراصل بچے ہی نہ تھے۔یہ خود جمہوریت کی وجہ سے نہیں ہوا تھا، بلکہ نوآبادیاتی استحصال کے درمیان وجود رکھنے والی جمہوریت کا کارنامہ تھا۔

۱۹۱۵ سے قبل کی منظم جمہوریت

اگر ہم وسطی، مشرقی اور جنوب مشرقی یورپ کے واقعات کا شمال مغربی یورپ میں رونما ہونے والے واقعات سے موازنہ کریں تو ہمیں تین واضح فرق نظر آئیں گے۔ان وجوہات کا تعلق قومی ریاستوں کے لبرل تصورات سے زیادہ عضوی تصورات کے غلبے سے تھا۔اس سے تاریک پہلو جلد ہی حاوی ہو گیا جس نے بالآخر فسطائیت کی صورت اختیار کر لی۔یہی تین وجوہات اپنے دور کی ترقی پذیر دنیا میں بھی نظر آتی ہیں۔یہی سبب ہے کہ وہاں نسل کشی اور فسطائیت کے حالات پھر پیدا ہو سکتے ہیں۔

پہلا فرق یہ ہے کہ جمہوریت کی خواہشات ان بے حد پس ماندہ ممالک میں تاخیر سے بیدار

ہوئیں ۔یہ ایسے دور میں سامنے آئیں جس میں سے 'اعلیٰ' سیاسی نظریہ پختہ جمہوریت کا تھا۔جس کے معانی میں یہ بات غالب تھی کہ 'تمام' لوگوں ، باالفاظ دیگر اٹھارویں صدی کے برطانوی 'لوگوں' اور 'عوام' کو لازماً حکومت کرنا چاہیے ۔یورپ کے وسط ،مشرق اور جنوب میں محدود پیمانے پر اینگلوامریکن قسم کی ، درجات میں بٹی ہوئی آزاد حکومتوں پر زیادہ مقبول عام قانونی جواز حاوی ہو گئے ۔اس کے باوجود عوام الناس کو بچانے کی خاطر، اعلیٰ طبقات کے افراد نے درمیانی نوعیت کا ایک مختلف نظام وضع کرلیا جو پارلیمنٹوں کے اقتدار کے مقابلے میں حق آزادی پر کم پابندیاں عائد کرتا تھا ۔تمام مرد ووٹ دے سکتے تھے لیکن ان کے نمائندوں کو ایک مضبوط انتظامیہ کے، جو عموماً بادشاہت ہوا کرتی تھی ، قانون سازی کے اختیارات میں شریک کرنا پڑتا تھا ۔جرمن بادشاہت بالکل خالص واصل نوعیت کی تھی :پارلیمنٹ (Reichstag) جسے عام مردوں کے ووٹروں سے منتخب کیا جاتا تھا ،بادشاہ اور اس کے وزراء کے ساتھ اختیارات میں حصہ دار ہوتی تھی ۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ''لوگوں'' سے بالا بالا ساز باز کر کے اور شاطرانہ طریقے سے اعلیٰ طبقے کے افراد ریاست کے اندر اپنے اختیارات استعمال کر سکتے تھے ۔علاقے کے اکثر حصوں کی پس ماندگی ان کی استعداد میں اضافے کا باعث ہوتی تھی ۔یہ 'لوگ' زیادہ تر دیہاتی تھے ،معمولی دستکاریوں یا چھوٹی چھوٹی عام ملازمتوں میں تھے اور کارکن طبقے کی تنظیموں سے ان کا کوئی واسطہ نہیں تھا ۔جرمنی خود ایسی پس ماندگی کی مثال نہیں ہوگا ۔حالیہ زمانے میں دنیا کے اکثر حصوں میں یہی صورت رہی ہے ۔موجودہ دنیا کے جنوبی ممالک میں محدود طور پر خود مختار ریاستیں مشکل ہی سے نظر آتی ہیں ۔اب یا تو ہر کوئی ووٹ دے سکتا ہے ،یا پھر کوئی بھی نہیں ۔اگر چہ ووٹ جزوی یا مکمل طور پر جعلی بھی ہو سکتے ہیں ، انتظامی اختیارات میں اضافہ کر کے یوں اس پہلے فرق نے ریاست کے تصور کو آزاد خیالی کے معیارات سے بھی آگے بڑھا دیا ۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ اب تک تمام ریاستوں سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ اپنے شہریوں کے لئے بہت سے کام کریں : اپنے علاقوں کی سالمیت کے لئے مضبوط بنیادی ڈھانچہ فراہم کریں ، لوگوں کو متحرک کرنا شروع کر دیں ، معاشی ترقی میں مدد کریں اور سماجی بہبود کا انتظام کریں ، جیسا کہ وکٹر پیریز ڈیاز (Victor Perez Diaz) لکھتا ہے ، 'ریاست ایک اخلاقی منصوبے کی حامل' بن گئی تھی [۹] ۔۱۸۹۰ اور ۱۹۰۰ کی دہائیوں میں ایسے ریاستی منصوبے اُمڈ پڑے جن کا خاکہ اصل فسطائیت کے حامی مصنفین جیسے

بارے Bares اور موریس Maurass کی تحریروں میں ملتا ہے جیسے یورپ کے وسطی دائیں حصہ میں سوشل کیتھلک نظریات اور وسطی بائیں حصہ میں اقتدار کے حامی سوشلسٹ جیسے جرمن، برطانوی "جدید لبرل"، فرانسیسی، ریڈیکل ریپبلکن اور روسی لبرل Zemstvo اہل فکر وتدبر۔ اشتراکیت بہرحال آگے نہ بڑھ سکی۔ پہلی جنگ عظیم اور بولشویک انقلاب تک اکثر اشتراکیت پسندوں نے مختصری بعد از انقلاب ریاست کے خیالی اور عامیانہ سے تصورات ذہنوں میں بسائے ہوئے تھے۔ بیسویں صدی میں ریاستیں بنتی چلی گئیں جس سے دنیا کے اکثر ممالک متاثر ہوئے۔ اگرچہ جدید لبرل تصورات کے حالیہ احیائے نو سے کچھ مداوا ہوا ہے، پھر بھی 'جنوب' میں ریاستوں سے یہ توقع کی گئی ہے کہ وہ سماجی اور معاشی ترقی میں گہرا ربط قائم کریں۔ وہ ریاست پسندی کے بہت زیادہ قائل تھے۔

تیسرا اور آخری فرق یہ ہے کہ اس علاقے پر 'کثیر الاقوامی' شاہی سلطنتوں کا تسلط قائم تھا جن میں (Hapsburg) رومانوف (Romanov) اور سلطنتِ عثمانیہ شامل تھیں۔ لہٰذا عام طبقاتی تنازعات میں گھری ہوئی بادشاہت کا مقامی تنازعات سے ٹکراؤ ہوا۔ جمہوریت کے دور میں یہ تنازعات طبقۂ اشراف کے مابین جھگڑوں سے تبدیل ہو کر فرضی قومی معاشروں کے تنازعات بن گئے۔ مقامی اشراف کو، جو کہ اپنے لئے نمائندگی کے حقوق کا دعویٰ کرتے تھے، نچلے طبقوں کی جانب سے دباؤ کا سامنا کرنا پڑا۔ اس دباؤ کا مقصد یہ تھا کہ "تمام" لوگوں کو دشمن بادشاہ اور اس کے مقامی مفاد پرست حامیوں کے خلاف متحرک کیا جاسکے[*]۔ جرمنوں، روسیوں اور ترکوں کی، اور بعد میں ہنگری کے باشندوں کی بادشاہتوں نے اس دباؤ کا جواب اپنی ہی 'نظر ثانی کرنے والی' قوم پرستی کی صورت میں دیا۔ کروشیائی (Croat)، روتھینز (Ruthenes) اور دیگر اقوام کو ماضی کی بوسنیا (Bosnia)، ترکی کے اور موجودہ سرب (Serb) تسلط پر ناراضگی ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ رومانیہ کے لوگ ہنگری کے باشندوں سے نالاں ہوں، ممکن ہے سلوویک (Slovak) لوگ چیک (Czech) لوگوں سے خفا ہوں اور قریب بسابقہ حاوی جرمنوں اور روسیوں سے تو ہوسکتا ہے کہ ہر ایک ناراض ہو۔ یہودیوں کے خلاف، جو کہ شاہی حکمرانوں کے مفاد پرست حامی تھے اور بظاہر تجارت، مختلف پیشوں اور اعلیٰ تعلیم کے معاملوں میں اکثر مراعات حاصل کرنے والی اقلیت تھے، نو آزاد قوموں نے بے حد نفرت کا اظہار کیا۔ اس طرح قوم پرستی کو آزاد خیالی کے معیارات سے زیادہ فروغ ملا۔ نو آبادیاتی استحصال کرنے والوں اور ان سے ساز باز کرنے

والوں کے خلاف، یہ خیال کیا جاتا ہے، کہ تمام مقامی لوگ متحرک ہو گئے تھے۔

جرمن پیپلز پارٹی کا تجربہ

ریاست پرستی کو زیر دست تقویت دینے والی مذکورہ بالا دو وجوہ اور قوم پرستی کو مضبوط کرنے والے ایک سبب نے عضوی قومی ریاست کو فروغ دیا، اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ میں ایک پرانی مثال پیش کرتا ہوں[۱۱]۔ ۱۸۸۲ء میں تین نوجوان آسٹریائی سیاست دانوں نے لنز پروگرام (Linz Porgramme) پیش کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ ایک نئی جماعت، جرمن پیپلز پارٹی (Deutsche Volkspartei) بنائی جائے۔ اس پروگرام میں جرمن قوم پرستی، عام ووٹ کا حق اور ترقی پسندانہ سماجی قانون سازی شامل تھی۔ اس پروگرام میں لبرل نظریات، آزاد سرمایہ دارانہ نظام اور مارکسی اشتراکیت کی برابر مذمت کی گئی۔ ان تینوں افراد نے یہ اعلان کیا کہ، چوں کہ لبرل نظریات کے حامی ایک ایسے آئین کی حمایت کرتے ہیں جو مفادات کے مسئلہ کو تحفظ دیتا ہے، لہٰذا وہ جمہوریت کے "عنصر" کو برقرار رکھیں گے۔ انہوں نے کہا کہ ان کے پروگرام "لوگوں کے مفادات۔ یعنی سب کی بھلائی" کے جواز کی بنیاد لوگوں میں اتحاد پر قائم ہے۔ یہ مجوزہ جماعت کبھی نہ بن سکی۔ تینوں سیاست دان علیحدہ ہو گئے اور انہوں نے اپنی اپنی الگ جماعتیں بنالیں۔ آملڈر (Alder) سوشل ڈیموکریٹس کا لیڈر بن گیا، لیوگر "Lueger" نے کرسچن سوشلسٹ جماعت بنائی اور شیونرر (Schoenerer) نے جس جماعت کی بنیاد رکھی وہ پین جرمن (Pan German) پارٹی تھی۔ دورانِ جنگ آسٹریا میں یہی تین بڑی سیاسی جماعتیں تھیں جن میں سے دو جماعتوں نے بہت بڑی فسطائی تحریکوں کو جنم دیا۔

آسٹریا کے یہ نوجوان، عوام اور ریاست کے ایک منظم تصور کی تصدیق کر رہے تھے۔ ان کے نزدیک 'لوگ' واحد اور نا قابلِ تقسیم طور پر متحد اور مضبوطی سے مربوط ہیں۔ اس لیے ان کی ریاست کی بنیاد تنازعات کو باقاعدہ طور پر منظم کرنے پر قائم نہیں ہونی چاہیے۔ ایک واحد قومی تحریک لوگوں کی نمائندگی کر سکتی ہے اور آخر کار سماجی گروہوں کے مابین مفادات کے تنازعے کے معاملات سے بلند تر ہو سکتی ہے۔ طبقاتی جھگڑے اور فرقہ وارانہ مفادات سے مفاہمت کرنے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ ان باتوں سے بلند تر ہونا ضروری تھا۔ بیسویں صدی کا آغاز ہوتے ہی یہ تصور ظاہر ہوا کہ بلند تر ہونے والا یہ واسطہ، ممکن ہے، ریاست ہی ہو۔

منظم طور پر رہنے کے تصورات میں بظاہر دو قباحتیں تھیں۔ پہلی تو یہ کہ یہ تصورات مکمل اطاعت شعاری کے متقاضی ریاستی نظام کی جانب لے جاتے تھے۔ ماضی میں اقتدار اور اختلاف رکھنے والی چند انفرادی جماعتیں اندرونی طور پر جماعتی جمہوریت قائم رکھ سکی ہیں۔ خود اپنے اندر منظم طور پر قائم مسابقت کے بغیر، انفرادی جماعتیں اشراف یا مطلق العنان افراد کے ہاتھ لگ جاتی ہیں۔ اب لوگوں کے فرض کیے ہوئے واحد اصل کو کون ظاہر کرے گا؟ انسانی معاشروں میں موجود حقیقی فرق کو دیکھا جائے تو جس ریاست پر اشراف یا مطلق العنان افراد کا کنٹرول ہوتا ہے، وہی سب سے آسانی سے ایک آواز میں بات کرنے کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ اس طرح اصلی جمہوریت عارضی ثابت ہوئی اور آگے چل کر اس نے اپنی ہی بات کو جھٹلایا۔ دوسری بات یہ ہے کہ عضوی نظام کے تحت رہنے کے نتیجے میں اقلیتی طبقوں اور سیاسی مخالفین کو قوم میں مکمل رکنیت سے خارج کر دیا گیا ہے۔ ان قوم پرستوں کو یہ باتیں ماننا پڑیں: (۱) قومی وصف، جو دوسرے تمام اوصاف سے ممتاز ہو (۲) ریاست پر ان کا وہ حق جس سے ان کے وصف کی ترجمانی ہو۔ (۳) ایسے 'غیروں' کا انخلا جن کے مختلف بنیادی خواص قوم کو کمزور کر دیتے ہیں۔

رُوس میں یہودیوں کا قتلِ عام ---- ۲۵ لاکھ یہودیوں کا انخلاء

لہٰذا مشرق میں انیسوی صدی کے اواخر میں اقلیتیں ایسے زبردست دباؤ کا شکار ہوئیں جو ان کے جبری انضمام سے جبری انخلا اور پھر جبری ترکِ وطن پر منتج ہوا[۱۳]۔ اس دباؤ کا نزلہ یہودیوں پر گرا اور ردِعمل کے طور پر ۱۹۱۶ سے قبل کی دہائیوں میں پچیس لاکھ یہودی مغرب کی جانب نقل مکانی کر گئے۔ روسیوں کی منظم قتل و غارت گری مزید ہلاکت خیز صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ ۱۸۸۱ سے ۱۸۸۳ کے دوران زار الیگزینڈر دوم کے قتل میں یہودیوں کو قربانی کا بکرا بنایا گیا، سیاست دانوں اور اخبارات نے ان شعلوں کو ہوا دی تو شاہی حکام مداخلت پر آمادہ نظر نہ آئے۔ بہر حال یہ فسادات نچلی سطح پر ہوئے تھے خصوصاً نوجوان مرد کارکنوں کی جانب سے جنھوں نے مزدوروں کی بے چینی کو یہودیوں کے سر تھوپ دیا[۱۴]۔ لہٰذا توقع سے زیادہ مار پیٹ، عصمت دری اور لوٹ مار کے واقعات رونما ہوئے۔ روس میں اگلے فسادات کا پھوٹ پڑنا سیاسی نوعیت کا تھا لہٰذا اس میں قتلِ عام بھی زیادہ ہوا۔ یہ واقعات ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۶ء کے درمیان ہوئے اور جاپان کے ساتھ جنگ اور ۱۹۰۵ کے انقلاب کے شعلوں نے انھیں مزید بھڑکا دیا

۔منظم قتل عام کی چھوٹی چھوٹی وارداتوں سے جبری بھرتی کے خلاف بے چینی میں اضافہ ہوا اور اس کا رخ بھی یہودیوں کی طرف موڑ دیا گیا۔ جب قدامت پسند روسی سیاست دانوں نے انقلاب مخالف عوام کے سامنے یہودیوں کو اشتراکیت کے حامی کے طور پر پیش کیا تو وہ یہودیوں کے اور بھی زیادہ جانی دشمن بن گئے۔ زار کی حکومت جو کہ محبت و نفرت دونوں طرح کا طرز عمل رکھتی تھی، تین ہزار یہودیوں کی پر تشدد موت پر فکر مند تھی، لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اقتدار کی حمایت حاصل کرنے میں یہودیوں کا قتل عام فائدہ دے سکتا ہے۔ اس عرصہ میں سیاسی صیہونیت یعنی فلسطین میں حصول وطن کے مقصد نے یہودیوں کو ترک وطن کے لیے، خواہ دباؤ کے تحت ہی سہی، ایک جواز فراہم کر دیا تھا۔ اس دباؤ کو وہ لادینیت اور انتہا پسندی کا حامل سمجھتے تھے۔ چوں کہ اقتدار کی جانب سے ان پر حملے بڑھتے جا رہے تھے، اس لیے جو یہودی بچ رہے تھے، وہ حکومت کے مزید مخالف ہو گئے اور اس سے حکومت کے حامی قوم پرستوں کی برانگیختگی میں شدت آتی گئی۔

پچاس لاکھ غیر یہودیوں کا انخلاء

لیکن معاملہ صرف یہودیوں تک محدود نہ تھا۔ اس عرصہ میں پچاس لاکھ سے زیادہ غیر یہودی مشرقی یورپی باشندوں نے بھی اپنے اقلیتی علاقوں سے، خصوصاً جہاں سلوواک (Slovaks)، کروشیائی (Croats)، جرمن (German) اور سلووینیائی (Slovenes) آباد تھے، ترک وطن کیا۔ انیسوی صدی کے دوران یورپ میں عثمانی ترک کی ہر شکست کے نتیجے میں بہت سے مسلمان مارے جاتے رہے اور بڑے پیمانے پر لوگ ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ تشدد کی آخری لہر جنگ بلقان کی صورت میں ظاہر ہوئی جس سے سلطنت عثمانیہ کے پانچ لاکھ عیسائی عوام شمال کی جانب فرار پر مجبور ہوئے اور غالباً ان سے کم تعداد میں مسلمان جنوب کی جانب چلے گئے۔ دونوں کو یہ خوف لاحق تھا کہ انہیں زمانۂ جنگ میں دشمن کے طور پر شناخت کر کے انتقامی کارروائی کا نشانہ بنایا جائے گا۔ با قاعدہ عضوی قوم پرستی، بڑھتے ہوئے ریاست پسندی کے تصور کے ساتھ مل کر شدت اختیار کرتی جا رہی تھی، لیکن جنگ عظیم نے اسے حقیقی نسل کشی کا روپ دیا جس میں ان مہاجرین نے غیر متناسب کردار ادا کیا۔

قوم پرست ترکوں کی جانب سے آرمینیا میں دس لاکھ افراد کا قتل عام

اس جنگ میں بڑے پیمانے پر نسل کشی کی گئی۔ ۱۹۱۵ میں ترکوں کے ہاتھوں آرمینیائی

باشندوں کے بڑے قتل عام کو، یورپ میں کیے گئے قتل عام جیسا نہ سمجھا جائے جو کہ ایک پس ماندہ یا ''بربریت والی'' اسلامی تہذیب کی موجودگی میں کیا گیا۔ وہ لوگ جدت پر قائم ایک لادینی ریاست کا تصور لیے ہوئے تھے؛ اس عنصر کا یورپ کے اقتدار و سیاست میں بڑا عمل دخل تھا؛ ان کے پیش نظر اعلیٰ ترین یورپی تھے۔ لہٰذا ان کی کچھ تفصیل بیان کی جا رہی ہے۔

یہاں پر مارے جانے والوں کی تعداد کوئی دس لاکھ سے بھی زیادہ تھی جو کہ ترکی کی سرزمین میں آباد آرمینیائی باشندوں کی آبادی کا ۵۰ سے ۷۰ فی صد بنتی تھی [۱۴]۔ اگر یہ تعداد جرمنی کے Final Solution میں قتل ہونے والے یہودیوں کی تعداد سے کم تھی تو اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ غیر جانب دار ملکوں کی طرف زیادہ آرمینیائی باشندے فرار ہونے میں کام یاب ہوئے تھے۔ ان میں سے ساڑھے تین لاکھ افراد یورپ پہنچ گئے تھے اور دورانِ جنگ نقل مکانی کرنے والے گروہوں میں یہ سب سے بڑی تعداد تھی۔ نسل کشی کا روائی کا فیصلہ کمیٹی برائے اتحاد و ترقی (Committee of Unity & Progress-CUP) نے کیا تھا جو نوجوان ترکوں کی اتحادی حکومت کا اعلیٰ ترین ادارہ تھی۔ یہ احکامات معتبر اتحادی گورنروں اور آرمی گروپ کمانڈروں کے توسط سے مقامی سول افراد، پولیس اور فوجی حکام تک پہنچائے جاتے۔ کچھ سرکاری عہدہ داروں نے ہر سطح پر یہ احکامات ماننے سے انکار کر دیا۔ بہت سی صورتوں میں یہ معلوم ہوا کہ انہیں عہدوں سے فارغ کر کے CUP کے خاص طور پر منتخب کردہ افراد کو ان کی جگہ لایا گیا۔ جو سرکاری عہدے دار اپنی ملازمتوں کے چھن جانے سے خوف زدہ تھے، انہوں نے بھی احکام بجا لانے ہی میں عافیت جانی۔ سرکاری، سویلین اور فوجی منتظمین کے ساتھ ساتھ ایک تیسرے مضبوط نسل کش ادارے، بنام ''تنظیم خصوصی'' (Special Organization) نے بھی کام دکھایا۔ یہ تنظیم تیس ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ اتحادی حکومت کے تطہیر کے عزائم کو پورا کرنے کے لیے ان میں عہدوں کا لحاظ رکھے بغیر افسر بھرتی کیے گئے [۱۵]۔

خلافتِ عثمانیہ کو ہٹانے والے جدید قوم پرست دہشت گرد

اتحادی تحریک کا اصل حصہ جدیدیت پر مائل نوجوان فوجی افسر اور شہری پیشہ ور لوگ تھے، بالخصوص ڈاکٹر جو اسی نوعیت کا سیاسی عمل سر انجام دے رہے تھے جو یورپ کے نصف سے زیادہ حصے میں

جاری تھا۔یورپ سے نقل مکانی کرنے والوں کی تعداد بھی خاصی تھی۔جس جمہوریت کی نوعیت سے وہ لوگ خود بھی بخوبی آگاہ نہیں تھے۔اسی جمہوریت کے نام پر انہوں نے ۱۹۰۹ میں عبدالحمید کی عثمانی سلطنت کا تختہ الٹ دیا تھا۔حکومت میں اپنی موجودگی کے باعث انہوں نے اپنی تحریک میں پہلے ہی سے بڑھتی ہوئی عضوی قوم پرستی کی شدت کو تیز تر کر دیا۔کیوں کہ جس عثمانی حکومت کو وہ پس ماندہ، کثیر النسلی، کثیر المذاہب، کہہ کر مذمت کرتے تھے،اب اسی حکومت سے وہ گلوخلاصی چاہتے تھے۔اگرچہ عوام کو اکسانے کے لیے وہ جہاد کے اسلامی عقیدے کو بہت آسان ترکیب سمجھتے تھے،لیکن خود اپنے لیے وہ ایک اسلامی نہیں بلکہ فرقہ پرستانہ شناخت پسند کرتے تھے۔یہ شناخت تورانی تھی جس کا تعلق ترک زبان بولنے والے ان لوگوں سے تھا جو ترکی سے مشرق کی جانب وسط ایشیا کی طرف پھیلی ہوئی سرزمین پر آباد تھے۔یہ لوگ غالباً فاتحین اٹیلا(Attila)، چنگیز (Genghis)اور تیمورلنگ(Tamburline) کی اولادوں میں سے تھے۔یہ بات اس دور کی نصف درجن منظم یورپی قومیتوں کے تاریخی مقولے سے کس قدر مشابہ ہے!اسی تورانی لبادے کی وراثت کا دعویدار ایک حریف یورپی طبقہ بھی تھا۔یعنی ہنگری کی فسطائی تحریک۔اس وقت حال ہی میں یورپی طاقتوں نے جس سلطنت کو تباہ کر ڈالا تھا،اب اتحادی، مغربی ایشیا کی جانب نئے رخ پر اس سلطنت کی بنیاد دوبارہ رکھنا چاہتے تھے۔

اتحادیوں کو یوں لگا کہ آرمینیائی اس مقصد میں رکاوٹ ہیں۔چوں کہ ترک لوگ اپنی عیسائی آبادی والے علاقے کھو چکے تھے،لہٰذا اب آرمینیائی ہی بچ رہنے والی سب سے بڑی اقلیت تھے جو واضح طور پر عثمانی ترکوں پر فتح حاصل کرنے والے یورپیوں سے روابط رکھتی تھی۔ان کے بڑے طبقے ملک کے مشرق کی جانب موجود تھے اور باقی ماندہ تورانی لوگوں کے ساتھ مواصلاتی راستوں پر آباد ہو کر ترکوں کے لیے مسلسل خطرہ بنے ہوئے تھے۔مشرقی انتہاپسند عیسائیوں کی حیثیت سے وہ بیرونی حفاظت کے لیے روس پر انحصار کرتے تھے،اور کچھ آرمینیائی واقعی روسیوں کی مدد کر رہے تھے جس کے بدلے میں ان سے ایک مملکت کا وعدہ کیا گیا تھا۔ان ساری باتوں نے انہیں متحد تورانی قوم کے دشمنوں کا حلیف بنا دیا تھا۔اصل قتل عام ۱۹۱۵ میں اس وقت شروع ہوا جب روسیوں کے خلاف قفقاز (Caucasus) میں بھیجی ہوئی انور پاشا کی فوج کو زبردست شکست ہوئی۔اس کا بدلہ آرمینیائی باشندوں سے لیا گیا اور جنگ کے حالات میں نہ مغربی دوستی اور نہ روس ان کو بچا سکے۔اس اعتبار سے مربوط قومی ریاست کی جانب ان کی

بطور خطرناک دشمن حیثیت یہودیوں سے ملتی جلتی تھی ۔ یہ سوال اہم ہے کہ یونانیوں، یہودیوں یا کردوں کے مقابلے میں آرمینیائی لوگ ہی ترکوں کے غیض وغضب کا شکار کیوں ہوئے ۔ اس کا جواب غالبًا یہ ہے کہ یہودیوں اور یونانیوں کو بیرونی ریاستوں کا تحفظ حاصل تھا خصوصاً طاقتور جرمن حلیف کا ۔ جب کہ ترکوں کو ایسا پس ماندہ سمجھا جاتا تھا کہ ان سے کوئی خطرہ نہیں ہوسکتا تھا، انہیں جبراً ضم کیا جاسکتا تھا جس کے لیے قتلِ عام کی ضرورت نہیں تھی ۔ لہٰذا ان باتوں کے اعتبار سے یہودیوں کا ' آخری حل ' (Final Solution) کوئی انوکھی بات نہیں تھی ، بلکہ جدید عضوی قومی ریاست کے نظریے نے نسل کشی کا جو سلسلہ شروع کیا، اس کی بدترین صورت ۱۹۱۵ میں نظر آئی ۔

نازیوں کے ہاتھوں یہودیوں کی نسل کشی

پہلی جنگِ عظیم میں اقلیتوں کو بہت بڑی تعداد میں نقل مکانی کرنا پڑی، جس کی وجہ سے بعض مواقع پر ان کے خلاف ظلم واستبداد بھی زیادہ ہوا ۔ اس طرح مثلاً ۱۰ فی صد سرب باشندے آسٹریائی فوجوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر بلغاریہ اور ہنگری کے کیمپوں میں بھیجے گئے ۔ ان میں سے اکثریت سے جبری مشقت لی گئی ۔ جنگ کا مقصد بیش تر کثیر الاقوامی ریاستوں کو تباہ کرنا تھا؛ اس جنگ نے روایتی قدامت پرستی کے نظریات کو بہت کمزور کردیا کیوں کہ عوام کا ان نظریات سے اعتماد اٹھ گیا تھا؛ اس جنگ نے ایک معاشی خاکہ پیش کیا کہ ریاستی مداخلت اور منصوبہ بندی سے ترقی کیوں کر حاصل ہوسکتی ہے، اور اس کی بڑے پیمانے پر متحرک فوجوں کا کام یہ تھا کہ وہ قوم پرستانہ مقاصد کے حصول کے لیے مقبولِ عام اجتماعی کاروائی کے لیے ایک فوجی اور پارلیمانی منصوبہ پیش کرے ۔

جنگ کے نتیجے میں مشرقی یورپ میں منظم قتلِ عام کی اور بھی زیادہ طاقت ور سیاسی لہر اس وقت آئی جب حکومتوں کے انتہا پسند حامیوں نے اپنے سیاسی دشمن بولشویک نظریے ' کا تعلق فرقہ پرست دشمنوں سے جوڑ دیا ۔ جرمن اور اطالوی جمہوریت پسندوں نے سلاو قوم (Slavs) پر حملہ کردیا گو کہ ان کا اصل نشانہ یہودی تھے ۔ اگر چہ کمیونزم کے حامی، سامی مخالف (anti-semitic) یا سلاو (Slavs) کے بھی مخالف تھے، پھر بھی ان کے قائدین کا خیال تھا کہ اصولی طور پر یہ بات غلط ہے، اور اشتراکی یا بدامنی کی بین الاقوامیت سے متنازع ہے ۔ روسیوں کی خانہ جنگی میں سُرخ آرمی کے دستوں نے مقامی دیہاتیوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی قتل عام کیا تھا ۔ لیکن پچیس ہزار یوکرائنی یہودی

خود یوکرائن ہی کے قوم پرستوں کے ہاتھوں مارے گئے اور پچاس ہزار سے زائد کو سفید فوج نے مار ڈالا جس کا الزام تھا کہ روس کی تباہی یہودی بولشویک سازشوں کا نتیجہ ہے جس میں زبان کا عنصر بہت اہم ہے ۔ ایسی صورت میں تو آزاد خیال Kadet whites نے بھی قتل و غارت کی مذمت نہیں کی ۔ شکست کے بعد صاحبانِ اقتدار فرار ہو گئے اور خفیہ اور موثر قسم کے ضابطے "Protocols of The Elders of Zions" (صیہونیوں کے بزرگوں کے اصول) مغرب کے سامنے پیش کیے ۔ اس خود ساختہ دستاویز میں دنیا کو فتح کرنے کا صیہونی منصوبہ پیش کیا گیا تھا ۔ یہودی بولشویک' سازش کا ذکر براعظم کے مشرق تک پھیل گیا ۔ روس، یوکرائن، پولینڈ اور بالٹک ریاستوں رومانیہ اور ہنگری میں اقتدار کی حامی تحریکوں نے مقامی لوگوں کو یہودیوں کے قتل پر راغب کیا[۱۶] ۔

۱۹۱۸ میں جبری ترکِ وطن کے معاہدے

ترکِ وطن کے ذریعے تطہیر کا عمل ۱۹۱۸ کے امن معاہدوں کے تحت ہوا جن میں Woodrow Wilson کے 'قومی حقِ خود ارادی' کے اصول کا نفاذ ہوا ۔ چیکوسلوواکیا اور یوگوسلاویا کے سوا ہر ریاست ایک ایسے غالب فرقہ پرست گروہ کے سپرد کر دی گئی جس میں کم سے کم 65 فی صد لوگ اسی فرقہ کے تھے ۔ اگر کسی کو اختلاف ہوتا تو اسے حق تھا کہ وہ ایک سال کے اندر اندر کسی دوسری ریاست کی طرف چلا جائے ۔ یہ اندازہ تھا کہ بہت سے اقلیتی لوگ ایسی ریاستوں میں چلے جائیں گے جہاں وہ فرقہ وار اکثریت کا حصہ بن جائیں گے ۔ ایک سال کے بعد وہ اقلیتیں یہ توقع رکھیں گی کہ ان کی ریاست معاہدہ امن پر عمل کرتے ہوئے اقلیتوں کے حقوق کی ضمانت دے ۔ لیکن اکثر صورتوں میں ایسا نہیں ہوتا تھا، اور حکومتیں ان حقوق کے معاملوں میں دلچسپی نہیں لیتی تھیں ۔ ان معاہدوں کی وجہ سے نقل مکانی کرنے والوں کی تعداد بڑھتی گئی جو کہ غیر متوقع نہیں تھی ۔ لیکن ترکِ وطن کی حقیقت، جسے معاہدوں میں بیان نہیں کیا گیا تھا، یہ تھی کہ یہ جبری ترکِ وطن تھا جس کو مقامی تشدد اور جائدادوں پر غصب سے شہ ملتی تھی اور کبھی کبھی تو یہ کاروائی خود ریاست کی جانب سے ہوتی تھی ۔

۱۹۲۶ تک یورپ میں مہاجرین کی تعداد ایک کروڑ تک جا پہنچی تھی

۱۹۲۶ تک یورپی دنیا میں مہاجرین کی تعداد ایک کروڑ تک پہنچ گئی جن میں سے ۱۵ لاکھ افراد کا

یونان اور ترکی کے مابین زبردستی تبادلہ کیا گیا (ان میں سے ۱۲ لاکھ نے ترکی سے نقل مکانی کی) اس طرح سے ۲ لاکھ ۸۰ ہزار مہاجرین کا یونان اور بلغاریہ کے درمیان تبادلہ ہوا۔ پولینڈ کے ۲۰ لاکھ باشندوں، ۲۰ لاکھ سے زائد روسیوں اور یوکرائنیوں بشمول تقریباً ۱۰ لاکھ جرمنوں، اندازاً ۲ لاکھ ۵۰ ہزار اہل ہنگری اور ۲ لاکھ افراد کو لتھوانیا، لٹویا اور ایسٹونیا سے ترک وطن کرنا پڑا۔

۱۹۱۴ سے قبل ۶ کروڑ یورپی عوام پر غیر ملکی حکومتیں مسلط تھیں جب کہ بعد میں یہ تعداد ۲ سے ڈھائی کروڑ رہ گئی۔ مشرقی یورپ میں صرف ۵ سال کے عرصے میں مطیع قوموں کی آبادی نصف سے چوتھائی رہ گئی۔ اب شہری حقوق کی شناخت فرقوں کی بنیاد پر کی جانے لگی۔ ایسی تطہیر مغربی معاشرے کی حدود میں نہیں ہوا کرتی تھی۔ اس کی حوصلہ افزائی کی گئی تھی جس کے لیے یورپ اور امریکہ جیسی عظیم طاقتیں ذمہ دار تھیں اور یہ سب کچھ ہٹلر کے منظر عام پر آنے سے قبل ہوا۔

قوم پرستوں اور قدامت پرستوں میں گٹھ جوڑ

جنگ کے زمانے میں اقلیتوں اور مخالفین کو قوم کی رکنیت سے مکمل طور پر نکالنے سمیت، عضوی قوم کے ریاستی تصور کو جرمنی، آسٹریا، اٹلی، پولینڈ لتھوانیا، لٹویا، اسٹونیا، رومانیہ، ہنگری، بلغاریہ، یونان (چیک کے زیر تسلط) چیکوسلواکیا، (سربوں کے زیر تسلط) یوگوسلاویا اور ترکی میں فروغ حاصل ہوا۔ بغیر ریاستوں کی قوم پرست تحریکوں، جیسے سلوواکی، یوکرائنی اور کروشیائی، نے اسی کی پیروی کی۔ یہ سب متحد قوم پر قائم ایک ریاست کے خواہاں تھے جہاں طبقاتی فرق کا جھگڑا نہ ہو، اور "دوسری" قوموں کو مکمل رکنیت سے خارج کر دیا جائے۔ جوں جوں قدامت پسندوں کو ایک تاریخی تبدیلی کا تجربہ ہوا تو ان لوگوں نے بھی سر اٹھانا شروع کر دیا۔ کمیونسٹوں سے مقابلہ کرنے کے لیے انہوں نے قوم پرستوں کے پس پردہ لوگوں کو متحرک کرنا شروع کر دیا[۱۷]۔ یورپ کے وسط، مشرق اور جنوب مشرق میں قدامت پرستوں اور قوم پرستوں کی قوتیں یکجا ہو گئیں۔ بعض اوقات تو قدامت پرست، اصل فسطائیت کو ختم کرنے کے لیے عوامیت پسند (populist) بلکہ فسطائیوں ہی کا روپ دھار لیا کرتے تھے۔ اس طرح کی عضوی قوم پرستی بہت کامیاب رہی کہ اس نے اوپر بیان کی گئی ریاستوں اور تحریکوں پر غلبہ حاصل کر لیا، ماسوائے چیک اور بلغاریہ کی حکومتوں کے جہاں تحریکیں زیادہ زور آور نہیں تھیں، سلوواک اور کروشیائی

تحریکوں کے، جوان سے بھی زیادہ غیر متحد تھیں ۔ان تحریکوں میں سے کچھ ہی اس حد تک آگے گئیں جس حد تک فسطائیت اثر پذیر ہوئی تھی ۔لیکن ان سب نے ایک فسطائی طرز تنظیم اختیار کر رکھا تھا۔یعنی نیم فوجی تشکیل ،جسے ''لوگوں'' کا مسلح دفاع کہا جاتا تھا جس کی مدد سے اس کے ''معاندین'' پر زبردست خوف مسلط کیا جا سکتا تھا،اور ساتھ ہی ساتھ 'لوگوں' میں موجود طاقتور حزب اختلاف کی زبان بند کی جا سکتی تھی ۔

قدامت پرستوں کی موجودگی بہت سی تحریکوں میں طبقاتی تعصب کی مضبوط ضمانت بنی ہوئی تھی اور فسطائیت کے معاملے میں یہ سب سے کم تھی ۔لیکن مخالفین کمیونسٹوں کو فرقہ پرست دشمن کہہ کر ان کی مذمت کی گئی؛لبرل لوگوں کو غیر ملکی 'بین الاقوامیت پرست کہہ کر، سوشلسٹوں کو 'بین الاقوامیت پرست' یا 'بولشویکی' (جس اصطلاح کا مقصد 'روسی' اور 'ایشیائی' وابستگی کو ظاہر کرنا تھا)، کہہ کر رد کر دیا گیا ،مذہبی اور فرقہ پرست اقلیتیں 'غیر ملکی مفادات اور ریاستوں کی نمائندہ تھیں ۔جبکہ لبرل لوگوں سے خاصا نرم رویہ رکھا جاتا تھا ۔ان کی مجالس منتشر کر دی جاتیں ،ان کے قائدین کو مختلف طریقوں سے ذلیل کیا جاتا ،نفرتوں کے ماحول میں محض انتخابی دھاندلیوں کے بہانے ان کے دفاتر بند کر دیئے جاتے ۔سوشلسٹوں کے ساتھ زیادہ خراب سلوک کیا جاتا ،کبھی ان پر پابندی لگا دی جاتی ،ان کے جنگجوؤں کو جیلوں میں ڈالا جاتا اور بعض اوقات قتل کر دیا جاتا ۔نیم فوجی ادارے ان کارروائیوں میں رہنمائی کا کام کرتے تھے ۔لیکن سوشلزم تو صرف ایک سوچ ،ایک عقیدے کا نام ہے ۔اگر سوشلسٹ اپنے عقیدے سے منحرف ہو جائیں تو انہیں 'ہم لوگوں' میں جبری طور پر ضم کیا جا سکتا تھا۔

مذہبی اقلیتوں پر ظلم و تشدد

مذہبی اقلیتوں کے ساتھ زیادہ برا سلوک کیا جاتا تھا ۔ان ریاستوں میں تقریباً سب کی سب ،اور ان کے ساتھ بغیر ریاستوں کی تین تحریکیں ،اپنا علیحدہ مذہب ،مسلک رکھتی تھیں ،جس سے گویا قوم کی روح کا اظہار ہوتا تھا ۔اقلیتوں کی عبادت گاہوں میں تشدد کیا جاتا ،اگر ان کا اثر و رسوخ دوسری ریاستوں تک پھیل جاتا تو انہیں کاٹ کے رکھ دیا جاتا ۔چھوٹی اقلیتیں جیسے Jahova's Witnesses اور Orthodox Innocentists کو، جو کہ غیر ملکوں میں غیر محفوظ تھے ،ان سے بھی بُرے حالات دیکھنا پڑے ۔بہر حال ،عیسائی مذاہب عقائد کے نظام تھے ۔اور سوشلسٹوں کی طرح

ان کے ماننے والے بھی اپنے عقائد سے پھر سکتے تھے۔دوسری جنگ عظیم کے دوران کروشیا کی Ustache نیم فوجی تنظیموں نے آرتھوڈوکس سربوں کو بڑے پیمانے پر مذہب بدلنے پر مجبور کیا۔اگرچہ اس میں بہت قتل عام بھی ہوا۔

لیکن ۱۹۳۰ کی دہائی تک جملوں کا بڑا محور فرقہ وارا قلیتوں کو بنا دیا گیا تھا۔جرمن اور کروشیائی ،جرمن اور پولش، پولش اور یوکرائنی ،رومانوی اور ہنگری (Magyar) کے لوگ، کروشیائی اور سرب وغیرہ ،نے باہم مل کر ایک قابلِ قبول منفرد حیثیت حاصل کر لی تھی جو جزوی طور پر حیاتیاتی اور ثقافتی رنگ لیے ہوئے تھی لیکن بہت زیادہ موافقت پذیر نہیں تھی۔اپنی قوم کی سالمیت واتحاد کی خاطر غالب قومیتوں نے تدریسی اور شہری ملازمتوں کے لیے ایسے قوانین منظور کیے جن میں اقلیتوں کے خلاف امتیاز برتا گیا تھا ۔انہوں نے اقلیتوں کی ثقافتی اور سیاسی تنظیموں کے میل ملاپ کی آزادی بہت محدود کر دی۔لیکن جبری انضمام پھر بھی بہت زیادہ لوگوں کو متاثر نہ کر سکا۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ فسطائیت جس چیز پر اثر انداز ہوئی وُہ جرمنی کی عالمی تاریخی قوت تھی اور ہٹلر کا تاریخی دور تھا۔خبطی نازی قیادت کے بغیر فرقہ وارانہ تطہیر کے دوسرے مراحل کے مقابلے میں نسل کشی اتنی زیادہ واقع نہ ہوتی۔تاہم ،نازیوں کے ہاتھوں نسل کشی اور'آخری حل' (final Solution) کو ہر بات پر فوقیت دی گئی۔

نازیوں کے ہاتھوں ڈیڑھ کروڑ افراد کا قتلِ عام

سب سے پہلے قتل کیے جانے والے گروہ میں جرمن اور آسٹریائی اشراف شامل تھے جو دماغی طور پر معذور تھے۔نازیوں نے بیسویں صدی میں پروٹسٹنٹ یورپ اور امریکہ تک دماغی طور پر معذور افراد کے اتلاف اور منحرفین کے حیاتیاتی انضمام کا دائرہ قتل وغارت پر مبنی تطہیر تک وسیع کر دیا۔جنگ سے قبل ہی لوگوں کی 'حیاتیاتی خالصیت' کو بچانے کی خاطر ۷۰ ہزار دماغی مریضوں کو مار ڈالا گیا۔اس کے بعد ،نیم فوجی قائدین نے نسل کشی کی رہنمائی کا بیڑہ اٹھایا۔تقریباً ۲ لاکھ مزید مریضوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا کیوں کہ اس کاروائی کا جال ۱۹۳۹ کے بعد اتنا پھیلا کہ اس میں پولینڈ ،روس اور فرانس کے مریض بھی شامل کر لیے گئے تھے[۱۸]۔اس کے بعد نوآبادیاتی طرز کی 'مقامی صفائیوں' کی لپیٹ میں آریائی نوآبادیاتی بنانے والوں کے لیے زمین حاصل کرنے کی غرض سے پولینڈ کے ۲۰ لاکھ باشندے قتل

کر دیئے گئے [۱۹]۔ تناؤ اور کشمکش اس وقت انتہائی زیادہ تھا، جو کچھ عرصے تک ان جرمنوں اور پولش باشندوں کے درمیان قائم رہا جو کہ کسی دوسری ریاست میں بطور اقلیت رہ رہے تھے۔

روسی اور یہودی اگلے دو بڑے اہداف ثابت ہوئے۔ پورے یورپ میں آباد یہودیوں کا تین چوتھائی یعنی ۶۰ لاکھ کے قریب یہودیوں کو بہت بے رحمی سے قتل کر دیا گیا۔ اگرچہ تقریباً ۷۰ لاکھ غیر یہودی سوویت شہری، اور ۳۰ لاکھ سوویت جنگی قیدیوں کا قتل بھی یقیناً سیاسی تطہیر کا حصہ تھا جس کا نشانہ وہ افراد تھے جنھیں نازی بولشویک کہتے تھے۔ ان مظلوم افراد کو نسلی اصطلاح میں (Untermenschen) یعنی حقیر انسان کہا گیا۔ اس کے بالکل برعکس یہودیوں کو، جو ظاہری طور پر نسلی یا مذہبی ہدف تھے، 'سیاسی اصطلاح' میں عموماً 'یہودی بولشویک' کہا گیا۔ یہودیوں اور روسیوں کو 'بین الاقوامی سازش' میں متحد کمیونسٹوں کی حیثیت سے دیکھا گیا۔ یہودیوں پر سرمایہ دارانہ نظام سے متعلق 'بین الاقوامی سازش' کا الزام بھی لگایا گیا اور ان پر ان لبرل قوتوں سے ساز باز کا الزام بھی لگا جنھوں نے پہلی جنگِ عظیم کے بعد جرمنی کو ذلیل کر کے رکھ دیا تھا۔ قتلِ عام کے احکام میں، جرمن فوجوں کو، سیاسی اور نسلی اہداف بالعموم بتا دیئے جاتے تھے یعنی یہودی، خانہ بدوش، کم تر نسل کے لوگ، معاشرے سے الگ تھلگ لوگ، اور سوویت حکومت کے سرکاری افسران، یا قیدیوں میں موجود تمام نسلی اور سیاسی طور پر ناپسندیدہ لوگ یا "دوسرے درجے کے ایشیائی"، 'مجرم افراد'، 'سماج دشمن عناصر' اور 'ہنگامہ کرنے والے' اور 'تخریبی کاروائیاں کرنے والے'۔ آخر میں خانہ بدوشوں، بہت سے چھوٹے فرقوں کے گروہوں، جیسے کاشوبی (Kashubians) سربوں اور کرمشک (Krimtchaks) کو نشانہ بنایا گیا، جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ غیر یقینی نظریات پر جمے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ جسمانی طور پر معذور افراد، جرائم پیشہ افراد، ہم جنس پرستوں اور (Jehova's Witnesses) کو بھی قتلِ عام کا نشانہ بنایا گیا۔ زعم خود عضوی قوم پرستوں کی طرح دشمنوں کا صفایا کرنے کی خاطر نازیوں نے ایک ملی جلی سیاسی فرقہ پرستانہ، مقامی و بین الاقوامی سوچ پیدا کر لی تھی۔

نسل پرستی کے جوش میں نازیوں کی درندگی

اگرچہ نسل کشی کے ارتکاب میں بہت سے 'عام جرمن' ملوث رہے تھے، لیکن اصل کام حقیقی نازیوں' نے سرانجام دیا۔ جنگی جرائم میں ملوث ۱۵۸۱ جرمنوں کے حالاتِ زندگی پر حالیہ تحقیق کے مطابق

یہ لوگ یا تو قیادت کے خواہاں تھے یا بار بار قتل کا ارتکاب کرنے والے تھے۔ مجھے معلوم ہوا کہ درحقیقت یہ سب نازی تنظیم کے ارکان تھے جن میں سے دو تہائی بے شمار نازی کاروائیاں کر چکے تھے اور ان میں سے بھی نصف سے زیادہ افراد انتہائی تشدد کا تجربہ رکھتے تھے۔ میں یہ بھی دکھانا چاہتا ہوں کہ ان کو اصل نازی علاقوں سے یعنی "شکست خوردہ یا دھکائے گئے سرحدی علاقوں، عوام میں سے اور ایسے پیشہ ور لوگوں میں سے جو نازی نظریات سے بے حد متاثر تھے، بے حساب تعداد میں بھرتی کیا گیا۔ ان تمام تجربات نے انہیں ایسے زبردست قومی ریاست پسند بنا دیا جو عضوی قومی نسل کا قتلِ عام سمیت، ہر طریقے سے صفایا کرنے کے لیے بے چین تھے۔ ان نازیوں کو قتلِ عام میں زیادہ تعاون عضوی قوم پرست اور نیم فوجی تحاریک سے ملا جن کا ذکر میں کر چکا ہوں یعنی تھنڈر کراس (Thunder Cross)، جمہوریت پسند برادریاں لٹویا (Litvia) کے ملیشیا، لیتھوانیا کا ' Activist Front'، یوکرائن کی ONU، ہنگری اور رومانیہ کے انتہا پسند جمہوریت اور فسطائیت کے حامی، سلوویکیا کے Hlinka guards اور کروشیا کے Ustache۔ ان سب کا یہ موقف تھا کہ انہیں عضوی قوم کے لیے سیاسی و فرقہ وارانہ اور داخلی و بین الاقوامی خطرہ درپیش ہے۔ ان میں سے رومانیہ والوں کو یوکرائن کے قوم پرستوں اور قدامت پسند Innocentist کو قتل کرنے کا بہانہ بھی مل گیا، جب کہ Ustache نے اپنی سرزمین سے سربوں کو نکال باہر کیا، جن میں سے تقریباً ۳ لاکھ افراد کو قتل کیا گیا اور تقریباً اتنے ہی لوگوں کو بزور طاقت اپنے عقائد سے منحرف ہونے پر مجبور کیا گیا۔ یہاں تک کہ اطالوی فسطائیت پسند بھی، جو دراصل قوم کے نسلی تصور سے زیادہ تہذیبی تصور کے حامل تھے، ایتھوپیا میں نسل کشی کر کے نسل پرستی کے راستے پر گامزن ہو گئے۔ جنگ کے آغاز سے قریب ان میں سے بہت سے افراد نے اس کارروائی کا رخ یہودیوں کی طرف موڑ دیا۔

روسی کمیونسٹوں کی بربریت

کمیونسٹوں کا بھی ایک نکتہ نظر تھا۔ کمیونسٹوں پر دورانِ جنگ، باہمی طور پر مل کر حکومت کا تصور اتنا زیادہ سوار نہیں تھا اور ان کا نظریہ زیادہ مقبولیت حاصل نہ کر پایا تھا۔ نئی سوویت یونین نے اس ریاستی تصور کو فوراً قبول کر لیا جسے قبل از جنگ کی سوشلسٹ بالخصوص کمیونسٹ تحاریک نے رد کر دیا تھا[۳۰]۔ ستمبر ۱۹۱۸ تک سوویت یونین سے خودمختاری، یونینیں اور قانون قریب قریب رخصت ہو چکے تھے۔ (چیکا)

(Cheka خفیہ پولیس قتل و غارت گری کی شروعات کر چکی تھی ۔ دشمن (Kulak) طبقے کی تقدیر میں 'بے رحمی کی موت' کا فیصلہ کر دیا گیا تھا ۔ قیدیوں کے لیے بیگار کیمپ بنائے گئے اور 'سرخ دہشت' (Red Terror) کا باقاعدہ آغاز کر دیا گیا ۔ انتہائی جمہوریت پسندی کے برعکس ریاست پرستی کو اخلاقی اصولوں کے مقابلے میں زیادہ سیاسی اہمیت کا حامل بنا لیا گیا ۔ لیکن اب بولشویک تحریک سے فسطائیت کا رنگ جھلکنے لگا تھا ۔ ٹروٹسکی (Trotsky) نے مشہور تقریر کی جس کا عنوان واضح طور پر فسطائیت ظاہر کرتا تھا ۔ "کام، نظم و ضبط اور حکم ہی سوویت سوشلسٹ ریپبلک کو بچائے گا" ۔ بسا اوقات وہ نیم فوجی تنظیموں کے اوصاف کی تعریف بھی کرتا تھا؛ اس نے واضح طور پر کہا کہ معاشی مسائل کو کارکنوں کی منظم فوجیں ہی 'دور' کر سکتی ہیں ۔ فسطائیت پسندوں کی طرح بولشویک کے حامیوں نے بھی 'بزرگ جنگجوؤں' کو اعلیٰ مرتبہ اور مراعات دیں، ان کو فوجی کوٹ (Tunic) پہنائے گئے، اور وہ ایسے استعارات استعمال کرتے تھے جو انفرادی دستے انقلابیوں کے لیے قلعوں کو تباہ کرنے، (Shock Troops) مہمات، مزدوروں کی بریگیڈ وغیرہ کے لیے استعمال کرتے تھے ۔ تشدد سے 'سوشلسٹ اخلاقیات' اور 'سوویت آدمی' پیدا کرنے میں مدد ملے گی : جو نازیوں کے جرمن اخلاقیات، اور 'نئے آدمی' کے ہم پلہ ہوں گے ۔ مارکسی حامیوں میں "پرولتاریوں کی مطلق العنانیت" کا عقیدہ، جو انقلاب کے زمانے سے خوابیدہ تھا، پھر سے بیدار ہو گیا ۔

بولشویک اور فسطائیت درندگی کا فرق

اس کے باوجود بولشویک دشمن، فسطائی دشمنوں سے مختلف تھے ۔ بولشویک افراد میں قومی دشمنوں سے متعلق کوئی ابتدائی تصور نہیں تھا ۔ حالاں کہ وہ خانہ جنگی کے دوران یوکرائنی اور دوسری قومیتوں سے لڑ چکے تھے ۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ان کی ریاست میں (روسی) قوم شامل نہیں ہو گی بلکہ عبوری (Transitional) پرولتاری شامل ہوں گے ۔ یہ مانتے ہوئے کہ ان کے ہاں بہت سی قومیتیں موجود ہیں، انہوں نے کثیرا لثقافتی نظریے کی تائید کر دی ۔ یہ نظریہ اندھے تعصب پر مبنی نہیں تھا بلکہ نظریۂ وفاقیت سے ربط رکھتا تھا ۔ سوویت یونین "خودمختار قومی جمہوریتوں" کا وفاق تھا، ان میں سے ہر ایک کی اپنی جمہوری اور خودمختار ریاست تھی جب کہ چھوٹی ریاستوں کی خودمختاری کم تھی ۔ لہٰذا پرولتاریوں کے دشمن متعصب فرقہ پرست نہیں تھے بلکہ سیاسی حریف، طبقات اور غیر ملکی طاقتیں تھیں ۔ ان کے سیاسی حریفوں میں Whites، کاڈیٹ (Kadet)، سوشلسٹ انقلابی، مینشویک (Mensheviks)، اس وقت

کے ٹروٹسکی کے پیروکار اور 'کمیونزم' اور جمہوریت پسندوں کے مخالفین شامل تھے ۔لیکن یہ سب بالعموم دوسرے دشمن یعنی مخالف طبقات کے محافظ دستوں کا کام دے رہے تھے ۔بورژوائی ،خوب صورت بورژوائی ،جاگیردار طبقات اور کلاک (kulaks) سبھی پرولتاریوں کو آگے بڑھنے سے روک رہے تھے ۔لیکن چوں کہ بیرونی طاقتوں کی بھیجی ہوئی امداد سے ان دشمنوں نے سوویت یونین کو گھیر رکھا تھا ،اس لیے تیسرے مخالف طبقات کو عام طور پر "غیر ملکی غدار"، جاسوس اور تخریب کار، کہا گیا ۔

۱۹۲۰ میں لینن نے 'طبقاتی دشمن' کی تعریف یوں کی کہ "وہ خون چوسنے والی مکڑیاں اور جوئیں ،کیڑے مکوڑے ،کھٹمل ،اور پسو ہیں ۔پرولتاری ان لوگوں کو کہا گیا جو اندرونی اور غیر ملکی دشمنوں سے روابط رکھتے تھے ۔اور فسطائیت کی زبان میں جسے دشمن کہا جاتا تھا ،یہ اس سے بہت مماثلت رکھتے تھے ۔جیسا کہ (Saints) SS سے ظاہر ہوتا ہے ،اس زبان سے یہ تاثر ملتا ہے کہ "دشمنوں کو ہراساں کیا گیا ،اور انسانیت سے گرے ہوئے ،کہا گیا ہے ؛جو کہ لوگوں کو ایسا نقصان پہنچا رہے تھے کہ ان کا صفایا کرنا ضروری تھا ۔

اسٹالن کی جانب سے قتلِ عام کے اشارے

اسٹالن اس معاملے میں اور بھی آگے چلا گیا ۔اس کا کہنا تھا کہ ناقابلِ علاج طبقاتی دشمن بالخصوص 'کلاک' طبقہ جبری صنعتوں کے قیام زمین کے اجتماعی نظام کو برباد کر رہا ہے ۔چوں کہ کسی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ 'کلاک' ہے کون (اس اصطلاح کو لینن نے بڑے پیمانے پر متعارف کیا تھا) ،اور حکومت کی پالیسی کی مخالفت تقریباً تمام دیہاتی کر رہے تھے ،اس لیے مقامی سرکاری اہلکار ،اور ادھر اُدھر پھرنے والے نیم فوجیوں کو اپنا طبقاتی تجزیہ خود کرنا پڑتا تھا ۔اس مقصد کے لیے وہ فارم ہوتے تھے جن پر سرفہرست مکمل بات تحریر ہوتی تھی ۔طبقاتی اجنبیوں اور کول خوز (Kolkhoz) مخالف عناصر کا مشترکہ زمینوں سے اخراج وہ مختلف اشاروں سے طبقات کو ظاہر کرتے تھے ۔لن ویولا (Lynnviola) کا دعویٰ ہے کہ اہم بات 'پرانی حکومت' سے تعلق کا ہونا تھا[۴۱] ۔اس سے مراد بڑے یا معزز زمین دار ،مذہبی لیڈر ،گرجاؤں کے بڑے ،عیسائی فرقوں کے ارکان (خصوصاً ...... Baptists اور Evangelic als) ،متمول دیہاتی ،وہ دیہاتی جنھوں نے بعد کے زار کے دور کی سٹالپن (Stolypin) اصطلاحات میں شمولیت اختیار کر کے اپنی زمینوں کو اشتراک کاروباری برادری ،تاجر برادری ،زار حکومت کے افراد اور

پولیس والوں کو سیک کے بڑوں، زمینوں کا حساب کتاب رکھنے والوں اور دیہات کے بڑے بوڑھوں سے علیحدہ کرلیا تھا۔ اس کے علاوہ ہر اس شخص سے جس نے White سوشلسٹ انقلابیوں یا یوکرائن کے قوم پرستوں کی، خانہ جنگی کے دوران مدد کی تھی۔ یہاں ہمیں نظر آتا ہے کہ سیاسی اور طبقاتی نشاندہی، دشمنوں کی مجنونانہ تلاش کے انداز میں کی گئی۔ کبھی کبھار مقامی کمیونسٹ اپنی پارٹی کے اعلیٰ عہدیداروں کی خواہشات سے بھی آگے بڑھ کر کام کرتے تھے، طبقے کا تعلق وراثت سے جوڑتے تھے، مقامی طور پر دوسری بلکہ تیسری نسل کے لیے بھی غم و غصے کا اظہار کرتے تھے۔ بولشویک کے اعلیٰ افراد اس خونریزی پر اکسانے والی باتوں کی مذمت کرتے تھے ویولا کا کہنا ہے کہ سٹالن کے نظریات میں 'ایسی سیاسی جنگ کا عنصر شامل تھا جو اعلیٰ اور روایتی دشمنی کی وجہ سے بے قابو ہوا کرتا تھا، اب نچلے طبقے کی جانب سے بے قابو ہو گیا تھا۔ بہرحال دونوں عناصر کا یقینی ہدف اب طبقاتی دشمن تھے۔

کمیونسٹ روس اور چین میں خون ریزی کی تاریخ

اسٹالن کے نظریات کے زیر اثر قتل عام محض ایسا سوشلزم نہیں تھا جسے بالکل ختم کر دیا گیا ہو۔ سوشلزم ایک اجنبی، 'غیر' کا شدید احساس لیے ہوئے تھا۔ خاص طور سے سٹالن کے دور میں۔ سوشلزم کے مخالفین کا صفایا لاکھوں کی تعداد میں اگرچہ جلد ہی ہو گیا، کیوں کہ بورژوائی، خوبصورت بورژوائی یا کلاک یا پرانی حکومت کے طور پر، وہ 'طبقاتی دشمن' تھے جو پرولتاریوں، کے مخالف تھے۔ چونکہ موخرالذکر یعنی پرولتاری اب 'لوگ' بن گئے تھے، لہٰذا دوسرے طبقات ان 'لوگوں' کے دشمن قرار پائے۔ ایشیا میں چینی اور کمبوڈیا میں کمیونسٹ اس سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئے جب انہوں نے طبقاتی دشمن کی شناخت کے لیے خون ریزی کو قبول کر لیا۔ چینی آبادی ۱۹۴۸ء میں اچھے غیر جانبدار اور پرانے پس منظر کے حامی طبقوں میں بٹ گئی اور اس بات کا فیصلہ ان کے والدین بلکہ اب تو ان کے والدین کے بھی والدین یہ فیصلے کرتے تھے کہ لوگوں کا تعلق کس گروہ سے ہے۔ Khmer Rogue تنظیم تو اس درجہ بندی کے قتل و غارت گری کو انتہائی حدوں تک لے گئی، نسل کشی سے ملتی جلتی طبقہ کشی کی طرف لے گئی جب انہوں نے بورژوائی پس منظر کے حامل تقریباً نصف کمبوڈیائی باشندوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ لیکن جب انہوں نے ایسی کارروائیوں کا تعلق روایتی تنظیمی قوم پرستی سے جوڑا تو وہ ناکام ہو گئے۔ جب انہوں نے ویت نامیوں کی ہلاکت خیز تطہیر شروع کی تو کمیونسٹ ویت نامیوں کی فوج

نے حملہ کرکے انھیں طاقت کے زور پر بے دخل کردیا۔

بہت تھوڑی ایسی اشتراکی جماعتیں جو منظم راستے پر زیادہ دور تک جاسکیں ان کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ پرولتاریوں کا محافظ دستہ ہیں۔ دوسری جماعتوں کو یہاں تک کہ مخفی اتحادیوں کو بھی دوسرے طبقوں کی نمائندہ جان کر دشمن سمجھ لیا گیا تھا۔ اسپین کے اشتراکیت پسندوں کی Pueblo جس کا مطلب گاؤں بھی تھا اور لوگ بھی۔ لوگوں کی رکنیت سے بہت سوں کے افراد کو واضح طور پر خارج سمجھتی تھی جن میں اسپین کے مبلغین، جاگیردار اور دوسرے جنھیں وہ فسطائی کہتے تھے شامل تھے۔ یہ فسطائیت کی اصطلاح بھی غیرملکی ہی تھی۔ ان لوگوں کو Pueblo سے خارج ہونے کی بناء پر مار ڈالا گیا۔ تاہم جنگ کے زمانے میں بیشتر کمیونسٹوں نے محسوس کیا کہ طاقت کے حصول اور بقا کے لیے انھیں کارکن طبقے کے علاوہ بھی وسیع پیمانے پر دوسروں کی مدد کی ضرورت ہے۔ لہٰذا انھوں نے آبادی کے ایک بڑے حصے کو متحرک کرنے کی کوشش شروع کردیں۔ ان لوگوں کو ''لوگ''، ''کارکن لوگ''، ''جفاکش عوام'' یا ''کارکن اور کسان'' کہا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ سٹالن نے بھی لوگوں کو اکسانے کی خاطر اس سے بھی زیادہ پرانی اور کم پرولتاری رجحان والی اصطلاح، Narodny یعنی عوامی، استعمال کی جس میں کارکن بھی شامل تھے اور کسان بھی۔ سوشلزم، سوشلسٹ بین الاقوامیت کے لیے وقف اور بیشتر نسلی طبقات کے لیے روادار رہا۔ سوویت یونین نے دوسری جنگ عظیم میں ممکنہ غدار قوموں کے سوا اپنی حدود میں موجود اکثر ذیلی قوم پرست تحریکوں کی بہت موثر انداز میں حوصلہ افزائی کی۔ سوشل ڈیموکریٹس نے لوگوں کو خود سے الگ کرنے کے بجائے اپنے ساتھ شامل کرنے کے لیے انھیں قبول کیا۔ Nordic سوشل ڈیموکریٹس کا دعویٰ تھا کہ لوگ (Volk) ان کا حصہ ہیں۔ جس طرح کہ عوامی بہبود والے معاشروں کے تبصروں میں ''لوگوں کا گھر''، ''لوگوں کی صحت'' اور ''لوگوں کے تحفظ'' کے نعرے شامل ہوتے ہیں بلکہ ان کے دعوے میں سب باتیں شامل تھیں۔

ان سب باتوں کے باوجود فسطائی اور اشتراکی نظریات دونوں جدیدیت کی سیاسی فکر سے اخذ کیے گئے ہیں۔ دونوں کا دعویٰ تھا کہ وہ ''ہم لوگوں'' کے بطور واحد کارکن طبقے اور ایک مستحکم قوم کی حیثیت میں عضوی تصور کے نعم البدل کی نمائندگی کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مطلق العنان ریاستیں ایسا منصوبہ لیے ہوئے تھیں جس کے مطابق اس قوم کو دشمنوں سے پاک کرنا تھا۔ فسطائیت

اور اشتراکیت، لبرل جمہوریت کی طرح سیاسی نظریات کے ایک ہی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ یقینی طور پر جدید ہونے کی حیثیت میں وہ جمہوریت کا ایسا تاریک پہلو تھے جو لبرل جمہوری تصورات سے زیادہ منظم قسم کے تصورات سے پیدا ہوا۔

خون ریزی اور سفاکی کا عنصر جمہوریت کے دامن میں پوشیدہ ہے

میں یہ بیان کر چکا ہوں کہ جدیدیت کے دو مختلف تصورات نے جنم لیا۔ پہلے تصور کے مطابق شمال مغربی یورپ کی اور سفید فام آبادکاروں کی حکومتوں کو طبقاتی نزاع کا واضح طور پر احساس تھا اور انھوں نے اس کو باقاعدہ شکل دینے کی کوشش کی۔ اس طرح انھوں نے اپنے درمیان عضوی نہیں بلکہ لبرل جمہوریت کی صورتوں کو فروغ دیا اور یوں ان کو مضبوط بنایا۔ لیکن سفید فام آبادکاروں نے اپنے تمام طبقے کے لیے، الگ تھلگ مقامی "غیروں" کے برخلاف ایک عضوی تصور کو فروغ دیا۔ انھوں نے ان غیروں کے خلاف شدید نسلی تطہیر کے حربے آزمائے جس میں نسل کشی بھی شامل تھی۔ دوسرے تصور کے مطابق وسطی، مشرقی اور جنوبی یورپ کے مختلف حالات کا مطلب یہ تھا کہ اصل سیاسی مسئلہ طبقاتی نہیں تھا بلکہ نسلی درجہ بندیوں کا تھا۔ طبقات کے برعکس یہ ضروری نہیں کہ اکثر نسلی یا مذہبی طبقے ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہوں۔ یہ طبقات اپنی اپنی تنظیمی ریاستوں کے ساتھ اپنی تطہیر شدہ معاشرتوں میں رہ سکتے ہیں۔ وہ زیادہ تر اسی طرح رہ بھی رہے تھے۔ اس لیے دو مختلف انداز سے وسیع پیمانے اور ہلاکت خیز نسلی اور سیاسی تطہیر، دراصل جمہوریت کی ضد نہیں تھی جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ یہ خود جمہوریت ہی کے دامن میں پوشیدہ تھی۔

۱۹۴۵ کے بعد موت کا رقص

خونیں واقعات کی یہ تاریخ ۱۹۴۵ء میں بھی ختم نہ ہوئی۔ کیوں کہ نسل کشی کا سلسلہ جرمنوں پر مرکوز ہو گیا۔ جنگ کے بعد کی دو جرمن مملکتوں کے مشرق اور آسٹریا میں آباد ایک کروڑ ستتر لاکھ جرمن باشندوں میں سے (سوویت یونین میں رہائش پذیر ۲۰ لاکھ جرمن اس تعداد کے علاوہ تھے) ۱۱ لاکھ جنگ کی نذر ہوئے، ایک کروڑ ۱۷ لاکھ جرمنی واپس فرار ہونے میں کامیاب ہوئے، فرار کے دوران ۲۱ لاکھ جرمن مر گئے یا لاپتہ ہو گئے اور مشرق کے علاقے میں صرف ۲۶ لاکھ باقی رہ پائے۔ تقریباً ایک لاکھ کروشیائی باشندوں کو جب وہ ہتھیار ڈال چکے تھے، سربوں نے قتل کر دیا اور ایک

لاکھ ۵۰ ہزار ترک باشندوں کو بلغاریا سے نکال دیا گیا۔ یوگوسلاویا کے منتشر ہونے تک، مزید کوئی قتل عام نہ ہوا۔ لیکن بلغاریہ سے ترکوں کی جبری جلاوطنی کا سلسلہ جاری رہا۔ وہاں پر باقی رہ جانے والے ترک باشندوں سے یہ تقاضا کیا گیا کہ وہ اپنے نام بلغاریہ والوں جیسے رکھیں۔ ۱۹۸۹ء میں ۳ لاکھ ۵۰ ہزار ترک وہاں سے نکل جانے پر مجبور ہوئے۔

طاقت کے بل بوتے پر لبرل جمہوریت کی توسیع

کیا تاریخ کا یہ سلسلہ اب ختم ہو گیا ہے؟ کیا لبرل، درجہ بندیوں والی قومی ریاست اب کامیاب نہیں ہو گئی؟ ۱۹۴۵ء تک فسطائیت ناکام ہو گئی، ریاستی سوشلزم کا زوال زیادہ تر ۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۱ء تک ہوا۔ کیا لبرل جمہوریت کا دائرہ تمام مغربی یورپ، وسطی یورپ کے زیادہ حصے اور مشرقی یورپ کے کچھ حصے، اس کے علاوہ لاطینی امریکا کے کچھ علاقوں اور مشرقی اور جنوبی ایشیا تک وسیع نہیں ہو گیا؟ جمہوریت اپنانے کے عمل کا یقینی طور پر جدیدیت کے اہم اوصاف سے بہت تعلق ہے۔ معاشی ترقی کی سطح سے بھی اور خواندگی اور شہری ماحول سے بھی۔ تاہم مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جمہوریت میں ڈھلنے کے لیے معاشی ترقی کی جس قطعی سطح کی بظاہر ضرورت ہوتی ہے پوری بیسویں صدی میں اس مطلوبہ سطح میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا ہے۔ لبرل جمہوریت کا حصول دشوار تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس میں توسیع بسا اوقات طاقت کے زور پر ہوئی۔ جیسا کہ جرمنی، آسٹریا، اٹلی اور جاپان میں ہوا ہے۔ ثقافتی جال پھیلا کر بھی اس کو پڑوسی ممالک میں، ہم مذہبوں اور قریبی رشتے داروں میں پھیلایا گیا ہے۔ محققین نے ایک "برطانوی اثر" کا مشاہدہ کیا ہے۔ جس کے مطابق برطانیہ کی سابقہ نوآبادیاں جیسے ہندوستان یا جزائر غرب الہند میں دوسری طاقتوں کی سابقہ نوآبادیوں کے مقابلے میں لبرل ڈیموکریٹ بننے کے زیادہ امکانات موجود ہیں۔ دورِ حاضر میں ویٹیکن اور امریکی خارجہ پالیسیوں میں تبدیلی کے تحت جمہوریت اور انسانی حقوق کی حمایت سے جنوب میں اس کے امکانات بہت بڑھ گئے ہیں۔ فی الوقت ظاہری حالات لبرل جمہوریت کے حق میں جاتے ہیں، لیکن اس نوعیت کی مخصوص قسم کی پیش رفت کے تسلسل کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔

جبری انداز سے جمہوریتوں کا فروغ

جہاں کہیں جمہوریت کو کامیابی ملی اس میں اکثر منظم طرز حکومت کی جھلک نظر آئی۔

دراصل اب یورپ نسلی یگانگت کی جانب ہونے والی سو سالوں پر محیط تحریک کے اختتام کے قریب پہنچ چکا ہے۔ ۱۹۹۱ء میں کوسووو (KOSOVO) میں ۹۰ فی صد البانوی باشندے آباد تھے۔ سلووینیا میں ۸۸ فی صد سلووینیائی باشندے تھے۔ کروشیا میں ۷۸ فی صد کروشیائی باشندے تھے، سربیا میں ۶۶ فی صد سرب باشندے موجود تھے، مقدونیہ میں ۶۵ فی صد مقدونی باشندے آباد تھے۔ بوسنیا کے مسلمان بوسنیا کی کل آبادی کا صرف ۶۶ فی صد تھے لیکن وہاں پر اور کروشیا میں تطہیر کا عمل بہت تیزی سے قتل عام اور انتہائی جبری نقل مکانی میں بدل گیا۔ جب کوسووو میں البانوی باشندوں کے قتل یا اخراج سے تطہیر کر دی گئی یا انھوں نے اپنی چھوٹی سی ریاست حاصل کر لی تو سابقہ یوگوسلاویا کی تمام ریاستیں مل کر ایک نسلی معاشرے کا تقریباً ۸۰ فی صد بن جائیں گی۔ یہی صورت حال کسی دور کے قبرص کی متحدہ دو ریاستوں کی ہے۔ اکثر ذرائع ابلاغ اور بیشتر مغربی سیاست دانوں کی تقلید میں ہم اس تمام تطہیر کا الزام جنگ کے کچھ مجرموں کی شیطانی چالوں پر لگا سکتے ہیں۔ میں نے جو واقعات بیان کیے ہیں ان تمام میں واضح طور پر عضوی تحریکوں کو اپنے مخالفین پر گرفت حاصل کرنے کے لیے بہت جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ بہت احتیاط برت کر انھوں نے فتوحات حاصل کیں۔ اکثر صورتوں میں سخت مقابلہ ہوا، جزوی طور پر صبر بھی کرنا پڑا جس کا ذکر تاریخ کے صفحات پر موجود نہیں ہے۔ لیکن ان کا ایک پہلو پسندیدہ بھی رہا ہے۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے اواخر کے فیصلہ کن انتخابات میں، قوم پرست جماعتوں نے سابقہ یوگوسلاویا کی تمام جمہوریتوں میں اکثریت سے فتح حاصل کی۔ خصوصاً سربیا اور کروشیا میں کچھ جمہوریتوں میں عضوی نظریے کے رجحانات موجود تھے، لیکن دوسری تقریباً تمام جمہوریتوں میں ان رجحانات کو بہت تیزی سے فروغ حاصل ہوا۔ یقینی طور پر ۱۹۹۱ء کے بعد سے تطہیر بذریعہ قتل کے زوال میں رائے دہی سے انتخاب کے ساتھ ساتھ فوجی اور نیم فوجی ادارے بھی شامل ہوگئے تھے۔ نیم فوجی تنظیم "مقبول عام" عضوی نظریے کا لازمی حصہ رہی ہے اور اس نے اپنی منفرد جبری طاقت کو "لوگوں" کے درمیان موجود شکوک وشبہات کو خاموش کرنے کے لیے استعمال کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ دشمن کا صفایا کرنے کے لیے بھی۔ لیکن ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ ایسی تحریکیں یورپی روایات کا اہم حصہ ہیں۔ ان کی کامیابی کوئی عجیب بات نہیں ہے کیوں کہ وہ "ہم یعنی لوگ" اور "وہ یعنی دشمن" کے طاقت ور نظریے کو استعمال کر سکتے ہیں۔ جدید یورپ میں ایسے نظریے کا کوئی مختلف

نتیجہ بھلا کہاں رہا ہے؟

یورپی یونین کے ممالک میں مادی فوائد کے حصول کی خاطر مہاجرین کی آمد

جلد ہی عظیم یورپ بھر میں کثیر النسلی کے صرف تین مخصوص علاقے رہ جائیں گے۔ ''دوسروں'' کی مملکتوں میں روسی لوگ قابل ذکر اقلیتوں کی حیثیت میں رہیں گے (اور اسی طرح دیگر صورت میں اس کے برعکس)۔ کیا یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا؟ یہ کہنا تو مشکل ہے۔ دوسرے، پرانی کثیر النسلی ریاستوں میں سے مغربی یورپ میں چند ایک باقی رہ گئی ہیں: برطانیہ، سوئٹزرلینڈ اور اسپین جب کہ بلجیم بعد میں (۱۸۳۰ء) شامل ہوا۔ ان کو کثیر النسلی حیثیت منظم دور سے پہلے حاصل ہو گئی تھی جب نسلی تعصب کو خاص اہمیت حاصل نہیں تھی۔ ان ممالک میں سے صرف شمالی آئرلینڈ میں قتل کا رجحان باقی ہے۔ اگرچہ باسک (Basque) دہشت گردی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ یورپی یونین کے باقی تمام ممالک ۸۵ فی صد سے زیادہ یک نسلی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ چالیس برسوں کے دوران یورپی یونین کے ممالک کے درمیان ترک وطن بتدریج کم ہوتا رہا ہے۔ تیسرے مغربی یورپ کی سرحدوں کے باہر کے علاقوں سے آنے والے آبادکاروں کی تعداد اکثر قومی آبادیوں کا ۵ سے ۱۰ فی صد تک ہے۔ اس کے باوجود ان کے آبادکاروں پر دورانِ جنگ زمانے کی اقلیتوں کے برعکس، قوم پرست ان پر الزام نہیں لگاتے کہ قوم کو ان کی وجہ سے بیرونی خطرہ لاحق ہے۔ یہ سچ ہے کہ خصوصاً فرانس میں مسلمان آبادکار، پڑوس کے ممالک کے اسلام سے عیسائیت کو درپیش خطرات میں معاون ہو سکتے ہیں لیکن آبادکاروں کی اکثریت یورپ میں زیادہ مادی وجوہات کی خاطر آباد ہوئی ہے جن میں روزگار اور رہائش کی مسابقت شامل ہے۔ کسی قوم کی خالصیت کو ممکنہ ''خوف'' کے مقابلے میں یہ تنازعہ مادی مفادات کے خواہاں گروہوں میں زیادہ آسانی سے حل ہو جاتا ہے۔

قوم پرستی جدیدیت کے مقابلے میں زیادہ خطرناک قاتل ہے

منظم قوم پرستی تطہیر کے عمل میں قتل عام کی حد تک جدیدیت کے معاملے میں پورے یورپ کی جانب سے خدمات میں پیش پیش رہی ہے۔ یقیناً جب کوئی قوم تطہیر کے عمل سے گزر جاتی ہے تو اس کو تشدد کی مزید ضرورت رہتی ہی نہیں۔ لبرل قومی ریاستیں اپنی معصومیت کے ساتھ تطہیر کیے گئے لوگوں کی قبروں پر اپنی نشو ونما اور فروغ کی منزلیں طے کر سکتی ہیں۔ امریکا میں آسٹریلیا اور جرمنی

میں بالآخر شاید سربیا میں بھی لبرل قومی ریاستیں جنوبی اور وسطی امریکا میں، ایشیا اور اوشیانا کی طرح، چھوٹی چھوٹی مقامی قوموں کی تطہیر کا عمل جاری ہے جس کا ارتکاز زیادہ تر مقامی طور پر آباد نیم فوجی تنظیمیں کرتی ہیں ۔ بہت افسوس کی بات یہ ہے کہ سابقہ نوآبادیاں جن کی ایک دفعہ تطہیر اور نسل کشی ہو چکی، وہاں بعد میں بڑی تعداد میں آباد کاروں کے آنے پر، اپنے کثیر الثقافت ہونے پر فخر کر سکتے ہیں ۔ گو کہ غیر حاضر ہونے کی بنا پر مقامی قومیتیں خاموش ہیں، پھر بھی حالیہ آباد کاریوں کا کسی بیرون مملکت سے تعلق جوڑا نہیں جا رہا نہ ان آباد کار قومیتوں کی اس بات کی ضرورت ہی ہے کہ وہ مقامی خود مختار اداروں کو ڈرائیں دھمکائیں جس چیز کو امریکی کثیر الثقافت کہتے ہیں، وہ زیادہ تر سیاسی معاملہ ہے اس اعتبار سے کہ ثقافتیں مخالف ریاستوں کا تقاضا نہیں کرتیں اور اس کے علاوہ چوں کہ قومی ریاستوں کے لیے آباد کار بہت ہی کم خطرہ پیدا کرتے ہیں، اس لیے مقامی لوگ ان کا جواب عضوی قوم پرستی کی صورت میں نہیں دیتے ۔ بلکہ جب حکومت مزید آباد کاروں کے لیے سرحدوں پر سختی کر دیتی ہے تو وہ لوگ مطمئن ہو جاتے ہیں ۔

یک نسلی اور کثیر النسلی ممالک میں نسلی تطہیر کے مسائل

اب صورت حال یہ ہے کہ ہلاکت خیز تطہیر ہر جگہ بہت ہی کم ہو گئی ہے ۔ اگر چہ "تیسری دنیا" یا "جنوبی" سیاسی نظریے کے تحت عضوی قوم پرستی نظر آتی ہے لیکن اکثر معاملوں میں یہ زیادہ سخت نہیں رہی ۔ ملائیشیا کے وزیر اعظم نے واضح اکثریت کی حامل ایک جماعت کی حکومت کو اس فلسفے کے تحت جائز قرار دیا ہے کہ "گروہ اور ملک، فرد کے مقابلے میں زیادہ اہم ہوتے ہیں" ۔ اس طرز فکر کو وہ مغربی کے بجائے ایشیائی کہنا پسند کرتے ہیں ۔ اگر چہ ایک منظم قوم کا دعویٰ مکمل طور پر یورپی ہے ۔ مشرقی اور جنوب مشرقی ایشیا بہت سی مختلف قسم کی مملکتوں پر مشتمل ہیں ۔ ان میں سے کچھ تو بہت زیادہ یک نسلی ہیں (جیسے جاپان اور کوریا)، دوسری بہت کثیر النسلی ہیں (جیسے بھارت) ۔ چند ایک ممالک میں بہت زیادہ قوت پوشیدہ ہے ۔ چند ایک اسلامی ملکوں اور بھارت اور اسرائیل میں، زبردست قوت کے ساتھ بنیاد پرست ابھرے ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ غیر ملکی اور ملحدین کی غلطیوں، گناہوں اور تنزلی کے برعکس ان کے مذہبی لوگ ہی اصل سچائی اور نیکی کے حامل ہیں ۔ ایک مضبوط مذہبی مملکت ہی ایسی بات کر سکتی ہے ایسی مملکت کی عدم رواداری ہی اس کا اعلیٰ وصف سمجھی جاتی ہے ۔

سری لنکا اور انڈونیشیا میں بھی ایسے علاقے موجود ہیں جہاں قتل کے ذریعے نسلی تطہیر اب بھی ہوتی ہے۔ البتہ مجموعی طور پر بہت کم مشرق وسطی کے یا ایشیائی ممالک کو بظاہر منظم قوم پرستی کا شکار ہونے کا خطرہ ہے۔ بلا شبہ قبائلیت اس براعظم کی بہت بڑی سیاسی بدنصیبی ہے جس سے گروہوں کے مابین وقفے وقفے سے قتل و غارت کے واقعات جنم لیتے ہیں۔ تاہم چوں کہ اکثر افریقی ممالک میں بہت ساری نسلیں آباد ہیں لہٰذا، ان کی حکومتیں لازماً نسلی طور پر مخلوط ہوتی ہیں جس سے منظم قوم پرستی کو روکنے میں مدد حاصل ہوتی ہے۔ استثنائی صورتیں وہ ممالک ہیں جہاں مذہبی افتراق سے ان مخلوط حکومتوں کو زبردست عضوی مدد ملتی ہے۔ (جیسا کہ سوڈان اور نائیجریا میں) یا چند ایک معاملات جہاں صرف دو حاوی نسلی جماعتیں ہیں (جیسے کہ برونڈی اور روانڈا میں) یہ بات قابل ذکر ہے کہ دو نسلی جماعتوں کے معاملے میں قتل عام اور جبری ترک وطن کے ادوار HUTU تحریکوں کے ہاتھوں انجام کو پہنچے جس سے اکثریتی جمہوریت کی منظم قوم پرستی کو دھچکا لگا ہے۔

فسطائیت اور کمیونزم کی اصطلاحات اب گالی بن چکی ہیں

خوش قسمتی سے منظم نظریے کے اصول کا دوسرا حصہ یعنی انتہائی درجے کی ریاست پرستی اپنے قویٰ کھو چکی ہے۔ اس بات کا اعلان کچھ مذہبی بنیاد پرستوں کی جانب سے ہوا ہے۔ فسطائیت اور کمیونزم جو کہ انتہائی درجے کی ریاست پرستی کے تاریخی دعوے دار تھے، اس برے طریقے سے برباد ہوئے کہ ریاست پرستی کا سارا منصوبہ اب ناکام نظر آتا ہے۔ موجودہ منظم بااختیار حکومتیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ وہ جمہوری ہیں یا جلد ہی جمہوریت اختیار کرنے کی بات کرتی ہیں۔ فسطائیت اور اشتراکیت کی اصطلاحیں اب گالی سمجھی جاتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ماسوائے چند ایک بنیاد پرستوں کے ہمارا واسطہ "نازی" جیسی بے اثر اور فضول قسم کی نظریاتی تحریکوں سے نہیں ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ طاقت ور ملک کو روکرنے کا رجحان مدہم پڑ جائے گا۔ تب انتہا درجے کی ریاست پرستانہ اقدار پھر سے عضوی قوم پرستی کی تحریکوں کی مدد کر کے تطہیر کرنے والی تحریکوں کو مضبوط کریں گی تاکہ ایسے نظریات وجود میں آئیں جو فسطائیت جیسے سفاک ہوں۔

لبرل جمہوریت، سماجی تنازعات سے جنم لیتی ہے

جو میں نے بیان کیا ہے کہ کہاں اور کب نسلی اور سیاسی تطہیر کے امکانات موجود ہیں تو اس

کی مدد سے ہم تاریخ سے کیا سبق حاصل کر سکتے ہیں؟ کیا ایسے واقعات کی روک تھام کے لیے ہم کچھ اقدامات کی نشاندہی کر سکتے ہیں؟ سب سے پہلے تو ہمیں اس نظریے کی گمراہ کن پیچیدہ سوچ کو ترک کرنا ہوگا کہ جدیدیت کے نتیجے میں لبرل جمہوریت لازمی طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ دوسری بات ہمیں یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہیے کہ لبرل جمہوریت سماجی ہم آہنگی سے نہیں بلکہ سماجی تنازعات کی وجہ سے وجود میں آئی، خصوصاً طبقاتی تنازعہ سے اس کی حوصلہ افزائی کے لیے ایسے تنازعہ کو صاف دلی سے مان لینے اور باقاعدہ طور پر اس کے ساتھ مصالحت کے لیے رضامند ہونے کی ضرورت ہے۔ تیسری بات، منظم جمہوریت کے پنپنے کے امکانات وہاں موجود ہوتے ہیں جہاں ایک نسلی یا دو نسلی جماعتوں یا مذہبی اقلیتوں کے درمیان غالب گروہ بستا ہے۔ ایسی ہی اقلیتوں کو مادی تعداد رکھنے والے لوگوں کے لیے ایک خطرہ کہا جاسکتا ہے۔ اس ممکنہ خطرے کو یونہی رد کر دینے کے بجائے حقیقت پسندانہ طور پر اس کا سامنا کرنا چاہیے۔ یہ خطرہ عموماً اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب حاوی لوگوں کے خود ساختہ نمائندے ایک اقلیت پر کسی بیرونی دشمن یا استحصالی قوت، خواہ وہ بیرونی ملک یا کوئی بین الاقوامی سازش ہو کے ساتھ تعلقات رکھنے کا الزام لگاتے ہیں۔ ایسے دشمنوں کی نشان دہی پر تمام منظم لوگ، اپنے اندرونی اختلافات بھلا کر، احتجاج شروع کر دیتے ہیں۔ چوتھی بات یہاں مراد منفرد روا ضع قسم کے خطرے کی ہے جہاں اقلیت کی آبادی کسی ایک علاقے میں مرتکز ہو اور پڑوس کا ملک ان کی مدد پر مائل ہو تو ریاست کو ایسے علاقے کے کھو دینے کا زبردست خطرہ درپیش ہوتا ہے۔ جہاں صورتِ حال یہ ہو کہ کسی علاقے میں اقلیتی آبادی بہت زیادہ ہو اور ان کی مدد پڑوس کے بجائے دوسرے بیرونی ممالک کریں تو ممکنہ علیحدگی سے نئی مملکت بن جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جس علاقے میں اقلیتی آبادی زیادہ نہ ہو تو وہاں خطرے سے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہاں پر بین الاقوامی استحصالی قوتیں خاموش اور مخفی ہیں جیسا کہ "یہودیوں کے مالی سرمایہ دارانہ نظام (Jewish Finance Capitalism) یا یہودی بولشویک (Judeo-Bolshevism) کے تاریخی نظریات۔ پانچویں بات ہمیں اس ادارے کی نوعیت کی تعریف ضرور کرنی چاہیے جو لیڈروں، "لوگوں، اور اقلیتوں پر ان کے مشترکہ استبداد کو مربوط کرتا ہے: یعنی مسلح نیم فوجی ادارہ، جو کہ تنظیم کا ایک منفرد جدید اور عوامی ادارہ ہے۔

ایسے حالات میں ہمیں موجودہ دنیا کے بہت سے حصوں سے متعلق سوچنا چاہیے۔ بہت سے ترقی پذیر ممالک ایک واضح نسل یا مذہب رکھتے ہیں۔ بہت سے ممالک میں ایسی اقلیتیں موجود ہیں جو علاقائی تعصب رکھتی ہیں۔ ان میں سے کچھ اقلیتیں پڑوسی ریاست میں اکثریت میں ہوتی ہیں۔ بہت سے ممالک کو بیرونی سامراجیت اور/یا بین الاقوامی سرمایہ دارانہ نظام کے ہاتھوں استحصال کا تجربہ ہوتا ہے جس میں کچھ مقامی اقلیتیں ملوث ہوسکتی ہیں اور یوں ان اقلیتوں کو ان کی تعداد کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور کہا جاسکتا ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ جن چھوٹے ہتھیاروں پر نیم فوجی اداروں کا دارومدار ہوتا ہے اور جن کی مدد سے نوجوانوں کے چھوٹے چھوٹے گروہ اپنے ہی طبقے کے لوگوں کو منظم قوم پرستی کی قید میں جھونک دینے کے قابل ہوتے ہیں، ایسے ہتھیاروں کا حصول دنیا میں کبھی بھی آسان نہیں رہا۔ وقفے وقفے سے قائم ہونے والی منظم قوم پرستی کا یہ ایک انداز ہے جو کبھی کبھار یکدم خون ریز نسل کشی کی ہولناک شکل اختیار کر لیتا ہے۔

نسل کشی سے اجتناب کیسے ممکن ہے؟

کیا ہم شمال کے لوگ، جنوب کے ممالک کو ماضی جیسے بدترین واقعات سے بچا سکتے ہیں؟ اس مقصد کے لیے تاریخ کا صفحات پلٹ کر ہمیں عوام کے پسندیدہ اقتدار کے نظام کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ مغرب کے لبرل جمہوری نظام میں اکثریتی اور علاقائی صورت کی حکومت کو بہت اہمیت دے رکھی ہے جس کی بنا پر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تمام تر طاقت ریاست کو حاصل ہو جاتی ہے۔ جو اقلیتیں مختلف علاقوں میں چھوٹی تعداد میں پھیلی ہوئی ہیں ان کے حق میں ایسا نظامِ حکومت سود مند نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثریت مغرب سے نکلتی جا رہی ہے۔ چند ایک پرانے ممالک جیسے سوئٹزرلینڈ اور بیلجیم، جہاں متحدہ وفاقی اور سماجی طریقے سے اقتدار میں شرکت رائج ہے، یہاں کی آبادیاں محض اکثریتی ہی نہیں، بلکہ مذکورہ مسائل کا حل پیش کرتی ہیں۔ سابقہ کمیونسٹ یوگوسلاویا تو علاقائی اقتدار میں مشکلات ہٹانے کے معاملے میں بعض باتوں میں خاصا آگے بڑھ گیا تھا۔ اگر اس وقت بین الاقوامی برادری علاقائی اور اقتدار کی ان نزاکتوں اور خطرات پر توجہ دے دیتی تو کشت و خون سے لبریز نسل کشی کو روکا جاسکتا تھا[۴۳]۔ دوسری کسی بھی سیاسی حکومت کی طرح، جمہوریت بھی بے تحاشا مسائل لیے ہوئے ہے۔

اس کے علاوہ ایک بین الاقوامی حکومت بنائی جانی چاہیے جو علاقائی تنازعات کو حل کرے تا کہ جنوب کے ممالک میں عدم مساوات کے جھگڑے کم ہو سکیں اور ان ممالک میں اندرونی معاشرتی خصوصاً طبقاتی تنازعات پر قابو پایا جا سکے۔ حالیہ برسوں میں بین الاقوامی اداروں نے سرمائے کو تسلط کے 'مُردہ ہاتھوں' سے آزاد کرایا ہے اور معیشتوں کو آزاد منڈیوں جیسی سہولتوں سے درست کیا جا رہا ہے۔ گو کہ اس میں بے روزگاری، اجرتوں کے معیار اور کارکنوں کے تحفظات اور سیاسی نتائج وغیرہ کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ اس طرح سے تو غیر ملکی استحصال کے خلاف مقامی طور پر انتہائی قوم پرستانہ حالات جنم لے سکتے ہیں اور کوئی بھی مقامی اقلیت اس کا شکار ہو سکتی ہے بالکل اُسی طرح جیسے انڈونیشیا اور دوسرے مقامات پر چینی سرمایہ داروں یا ایشیا کے یہودیوں کے ساتھ سلوک کیا گیا۔ آخری اہم بات یہ ہے کہ شمال کو اپنے اسلحہ کی فروخت کو لگام دینا ہوگیا ـــــ ممالک کو تباہ کرنے والا بڑا اسلحہ اور نیم فوجی سطح پر استعمال ہونے والے چھوٹے ہتھیار دونوں۔ بندوقوں کے بل بوتے پر سرمایہ دار آزاد جمہوریت کو اپنے مفادات کی خاطر کچل ڈالتا ہے اور بیلٹ بکس کو ووٹوں سے بھر لیتا ہے۔

اگر یہ اقدامات نہ اٹھائے گئے تو وسیع پیمانے پر پھر سے نسل کشی کا ارتکاب ہو سکتا ہے۔ انسانیت کو انتہائی صورتوں میں زبردست سیاسی اور فوجی اور تیز ترین بین الاقوامی تشدد اور اذیت ناک دور کا سامنا ہو سکتا ہے۔ ہمارے پاس وقت ہے کہ اپنے حال اور ماضی کو حقیقت اور دیانت کی نظر سے دیکھیں۔ جدید اور قدیم دنیاؤں میں جدیدیت کے نتیجے میں فرقہ وارانہ اور سیاسی قتلِ عام ہوئے۔ جدید کثیر الجماعتی، آزاد اور سماجی جمہوریت کا حصول بہت دشوار ہے۔ منظم قوم پرستی اگرچہ زیادہ توجہ حاصل نہیں کر پائی لیکن یہ زیادہ مقبول ہے۔ اگر ہر طرف سے ناکامی ہو اور کوئی راستہ نہ بچے تو ہمیں وانس اووین (Vance Owen) کے منصوبے کی ضرورت پڑے گی تا کہ نسل کشی کو باہمی گفت وشنید کی مدد سے نرم تر تطہیر کی شکل دی جا سکے۔ اس طرح متفقہ طور پر آبادیوں اور جائدادوں کا تبادلہ، سرحدوں کی تبدیلیاں وغیرہ عمل میں آ سکیں گی۔ گھٹیا لیڈروں کو برا بھلا کہنے کے علاوہ بھی بہت کچھ کرنا ہوگا۔ موثر اور ٹھوس عمل کے بغیر ایسے لیڈروں کا کوئی نقصان نہیں بلکہ اُلٹا ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا۔ مشکل یہ ہے کہ چوں کہ ہم خود فرقہ وارانہ نسل کشی کے تجربہ

رکھنے والی ریاستوں میں رہتے ہیں، اس لیے ہماری لعنت وملامت میں بھی منافقت پائی جاتی ہے۔

References

1. L. Kuper, Genocide: Its Political Use in the Twentieth Century, New Haven 1981.
2. R. Smith, 'Human Destructiveness and Politics: The Twentieth Century as an Age of Genocide', in Genocide and the Modern Age, edited by I. Wallimann & M. Dobkowski, New York 1987.
3. See Z. Baumann, Modernity and the Holocaust, Ithaca 1991.
4. H. Fein, Accounting for Genocide, New York 1979, p.8.
5. R. Rummel, Death by Government, New Brunswick 1994, pp. 12-24.
6. R. Melson, Revolution and genocide: 'On the Origins of the Armenian Genocide and the Holocaust', Chicago 1992, ch.9.
7. In fact, the most violent cleansings of this period tended to be those on the European periphery, where exploited classes could also be defined as culturally - though rarely ethnically - inferior. This was so in the ferocious 'Highland clearances' by landlords of their crofters, resulting in much coerced

emigration to the New World.

8. D. Champagne, Social Order and Political Change: Constitutional Governments under the Cherokee, the Choctau : the Chickasaw and the Creek, Stanford 1992.

9. V. Perez Diaz, The Return of Civil Society, Cambridge, MA 1993.

10. See M. Mann, The Sources of Social Power. Vol. II: The Rise of Classes and Nation-States 1760-1914, Cambridge, MA 1993, ch. 10.

11. Drawn from E. Schmidt-Hartmann, 'People's Democracy: The Emergence of a Czech Political Concept in the Late Nineteenth Century', in East European History, edited by S. J. Kirchbaum, Columbus 1988 - she also instances a very similar movement among Czech politicians of the following decade.

12. Most of my figures on emigrations are drawn from R. Pearson, National Minorities in Eastern Europe, 1848 - 1945, London 1983 and M. Marrus, The Unwanted: European Refugees in the Twentieth Century, Oxford 1985.

13. J. Kier, 'Unravelling of the Conspiracy Theory: A

New Look at the Pogroms', East European Jewish Affairs, vol. 23, 1993, pp. 78-89.

14. There are now several reliable overviews of this genocide - for example, V. Dadrian, The History of the Armenian Genocide, Providence 1995; R. Hovannisian, ed., The Armenian Genocide in Perspective. New Brunswick 1986; G. Libaridian, 'The Ultimate Repression: The Genocide of the Armenians, 1915-1917', in Genocide and the Modern Age, edited by Walimann and Dobkowski.

15. V. Dadrian, 'The Role of the Special Organisation in the Armenian Genocide in the First World War', in Minorities in Wartime, edited by P. Panayi, Oxford 1993, p. 68; The History of the Armenian Genocide, pp. 43-9.

16. P. Kenez, 'Pogroms and White Ideology in the Russina Civil War', in Pogrom: Anti Jewish Violence in Modern Russian History, edited by J. Klier & S. Lambroza, Cambridge 1992; Marrus, The Unwanted, pp. 62-64.

17. Michael Mann, 'Sources of Variation in Working-Class Movements in Twentieth Century Europe', NLR 212, July-August 1995, pp. 14-54.

18. M. Burleigh, Death and Deliverance: 'Euthanasia' in Germany, 1900-1945, Cambridge 1994.

19. For the murder-rates among the Slav nations see M. Berenbaum, ed., A Mosaic of Victims. Non-Jews Persecuted and Murdered by the Nazis, New York 1990.

20. Richard Pipes, 'The Russian Revolution, New York 1991, chaps. 15 - 18.

21. I. Viola, 'The Second Coming: Class Enemies in the Soviet Countryside, 1927-1935, in Staliinist Terror: New Perspectives, edited by J.A.Getty & R. Manning, Cambridge 1993.

23. See S. Woodward, Balkan Tragedy,Washington, DC 1997.

The Dark-Side of Democracy:

Explaining Ethnic Cleansing

Michael Mann

Professor of Sociology, UCLA,
234 Haines Hall, 155103,
Los Angeles CA 90095-1551.
E-mail: Mmann@ucla.edu

Michael Mann   The Dark-Side of Democracy: Explaining Ethnic Cleansing

Michael Mann: The Dark-Side of Democracy: Explaining Ethnic Cleansing

Chapter 1: The Argument

> 74-year-old Batisha Hoxha was sitting in her kitchen with her 77-year-old husband, Izet, staying warm by the stove. They had heard explosions but did not realize that Serbian troops had already entered the town. The next thing she knew, five or six soldiers had burst through the front door and were demanding "Where are your children?".
> The soldiers began beating Izet, "so hard that he fell to the floor", she said. While they were kicking him, the soldiers demanded money and information on the whereabouts of the couple's sons. Then, while Izet was still on the floor looking up at them, they killed him. "They shot him three times in the chest", recalled Batisha. With her husband dying before her, the soldiers pulled the wedding ring off her finger.
> "I can still feel the pain", she said. They fired shots ... and finally they kicked Batisha and a 10-year-old boy who was staying with them and told them to get out.
> "I was not even outside the gate when they burned it"... Her husband's body was in the flames. In that moment she was paralyzed. She was standing on the street in the rain with no house, no husband, no possessions but the clothes she was wearing. Finally, strangers passed in a tractor and bundled her into their wagon. Batisha's daughter later found her in a refugee camp in northern Albania.
> Looking tenderly at her one photograph of herself and Izet, Batisha murmurs: "Nobody understands what we have seen and what we have suffered. Only God knows."[1]

This is how murderous ethnic cleansing was wreaked on one household in the village of Belanica in Kosovo, formerly part of Yugoslavia, in the very last year of the 20th century. The perpetrators were Serbs, using murder and mayhem to terrify the local Albanians into fleeing the area. Then it could be occupied by Serbs, as was "their right". For, said these Serbs, though the population of Kosovo is 90% Albanian, this was the Serb heartland, the home of their ancient battlefields and monasteries. Now, of course, the Kosovo boot is on the other foot. Since 1999 it has been Albanians who have been terrorizing and kicking out Serbs. Kosovo is now cleansed, not of Albanians, but of almost all its Serbs.

But change the names of the people involved and the incident could have occurred almost anywhere in the world over the last few centuries – in Australia, Indonesia, India, Russia, Germany, Ireland, the United States, Brazil. Ethnic cleansing is one of the main evils of modern times. We now know that the Holocaust of the Jews – though unique in important ways – is not unique as a case of genocide. The world's genocides remain thankfully few, but they are flanked by numerous other cases of somewhat less severe but nonetheless murderous cleansing.

---

[1] We know too –– thanks to Los Angeles Times reporter John Daniszewski, whose extensive, graphic report on Belanica appeared in the paper on April 25, 1999.

Though the menace of such atrocities is generally recognized, our understanding of it remains as primitive as the behaviour itself is often said to be. Two rather simple opposed theories predominate: that it is perpetrated by entire primitive peoples or by evil, manipulative elites. Books purporting to explain the cases discussed in this book in such terms continue to pour out. These two explanations offer us comfort, since we can apparently blame human beings who are utterly unlike ourselves for such atrocities. But they are false: the perpetrators are much too like us for comfort.

In this book I advance a better, though more complex explanation. For the sake of clarity, I lay out my explanation up-front and beforehand, in the form of eight general theses. I hope to prove them in the course of the book by examining in detail the very worst cases of cleansing, those which have involved mass murder. So if you are initially sceptical of some of my theses, I urge you to suspend disbelief until you have looked at some of these cases.

(1) My first thesis concerns the broad historical era in which murderous cleansing became common. It is the depressing news broadcast in the title of this book. **Murderous cleansing is modern, because it is the dark-side of democracy**. This is my most provocative thesis, which many are bound to fiercely reject. We are accustomed to think of democracy as bringing nothing but good to the world. Let me make clear at the outset that I do not claim that it is democracies that routinely commit murderous cleansing – though some do. Nor do I reject democracy as an ideal – I endorse that ideal. Yet democracy has always carried with it the possibility that the majority might tyrannize minorities, and this possibility carries more ominous consequences in certain types of multi-ethnic environment.

This thesis has two parts, concerning modernity and democracy. Ethnic cleansing is essentially modern. Though not unknown in previous history, it became more frequent and deadly in modern times. Later chapters will support this with broad-ranging historical analysis. But a moment's reflection by any adult would also support it -- during our own lifetimes things got a lot worse! The 20th century death-toll through ethnic conflict amounted to somewhere over seventy million, dwarfing that of previous centuries. Even conventional warfare increasingly targeted entire "peoples" as "the enemy". Whereas civilians accounted for below 10% of deaths in World War I, they rocketed to over half in World War II, and to somewhere above 80% in wars fought in the 1990s. Ethnically-targeted wars boomed in mid-century and then again from the 1970s to the late 1990s [2]. Ethnic tensions (including religious ones, which I treat as a specific type of ethnic conflict) continue to simmer as I write this, in the year 2001 – in Northern Ireland, the Basque Country, Cyprus, Bosnia, Kosovo, Macedonia, Israel, Iraq, Chechnya, Azerbajian, Afghanistan, India, Kashmir, Burma, Tibet, Chinese Central Asia, Fiji, the Southern Philippines, various islands of Indonesia, the Sudan, Sierra Leone, Liberia, Nigeria, Congo, Rwanda and Burundi. Over half these cases involve substantial killing. As you read these words, one ethnic crisis will be probably exploding into violence on your television screens or

[2] It is impossible to give exact figures, but see Chesterman (2001: 2); Gurr (1993 & 2000) and Markusen & Kopf (1995: 27-34) for some rough estimates.

newspapers, while several other explosions will not be deemed newsworthy. The 20th century was bad enough. Perhaps the 21st will be even worse.

The above paragraph was written before September 11, 2001. The mayhem committed on that day, and "the war against terrorism" that it triggered, have imprinted the horror of murderous ethnic and religious strife on the consciousness of the entire world. It has especially struck home in the prosperous countries of the North, mostly shielded from such strife over the past half-century. Americans especially have been led to contemplate matters that they thought were long-gone from their world (in fact, since they exterminated almost all their own Indians in previous centuries). Neither the attack of September 11 nor the retaliatory attack on Afghanistan had as their intent ethnic cleansing. As my Table 1.1 (presented a little later in this Chapter) makes clear, there are many types of mass killing besides murderous ethnic cleansing. Yet it is clear that these attacks can only be understood in the light of a linked series of serious cases of ethnic cleansing in the world today. Especially relevant are those involving Jews and Muslims in Palestine, Sunni and Shi'ite Muslims in Iraq, Russians and Chechens, Kasmiri Muslims and Hindus, and "tribal" ethnic cleansings in Afghanistan. These have been raging for years – like other cases in the world. What makes these more dangerous is that small groups I shall label "combat fundamentalists" form one of the parties, and that some of the cases involve the global imperial Power, the United States. I shall deal with September 11 and its background in my concluding Chapter. For the moment, I use it only to reinforce part of my first general thesis. Ethnic cleansing is modern.

Thus, unfortunately for us, murderous ethnic cleansing is not "primitive". It belongs not to "backward" or "alien" peoples – despite the gross stereotypes of Muslims or Afghans recently circulating. It belongs to our own civilization and to us. This is because of the second part of this thesis: it is the perversion of our modern aspirations to democracy in the nation-state. Democracy means rule by the people. But in modern times "the people" has come to mean two things. The first is what the Greeks meant when they invented the term: their word *demos* meant the ordinary people, the mass of the population. So democracy is rule by the ordinary people, the masses. But in modern times "the people" has conveyed a second sense , as a "nation" or as the Greek term *ethnos*, an ethnic group – a people which shares a common culture and sense of heritage, distinct from other peoples. But if "the people" is to rule in "its own" nation-state, and the people is defined in ethnic terms, what is to happen to those of different ethnicity? Answers have often been unpleasant – especially when one ethnic group forms a majority, for then it can rule "democratically" but also tyrannically. We will see that in some contexts authoritarian regimes did better at handling ethnic conflicts than did democratic ones. Of course, the ideal is still a democratic one. But democracies in certain multi-ethnic contexts need particular institutions to restrain the tendencies of rule by the people.

We find that murderous cleansing is moving across the world as the world modernizes and democratizes. This is why its past lay mainly among Europeans, who invented the democratic nation-state. The countries inhabited by Europeans – in Europe and elsewhere – are now safely democratic, but most have also been ethnically cleansed. Now the epicentre of murderous cleansing has moved into the South of the world. Unless humanity takes evasive action, it will

continue to spread until democracies – hopefully, not ethnically-cleansed ones – rule the world. Then it will ease. But if we wish to ease it quicker from the world, we have to face squarely up to the problems of modernity and democracy. It is our problem and so we must understand it better.

(2) **Ethnic hostility rises where ethnicity trumps class as the main form of social stratification, in the process "capturing" and "channelling" class-like sentiments toward ethno-nationalism.** Cleansing was rare in the past because most big historic societies were "class-divided". Aristocracies or other small oligarchies dominated them and they rarely shared a common culture or shared sense of ethnic identity with the common people. In fact they despised the people, often considering them barely human. "The people" did not really exist across class lines – class trumped ethnicity. Even in the Roman Republic, with its representative institutions, the state motto was SPQR, *Senatus Populusque Romanus*, "The Senate **and** the People of Rome", two different entities.

Even the first modern societies were dominated by the politics of class. Liberal representative states first emerged as a way of compromising class conflict, giving them a plural sense of "people" and "nation", and so they also tolerated some ethnic diversity. But where the modern struggle for democracy involved "a whole people" struggling against rulers defined as "foreign", an ethnic sense of "the people" arose. Here ethnicity often "captured" class resentments, leading to a sense of "the people" as a "proletarian nation" asserting fundamental democratic rights against an upper-class "imperial nation". Imperial nations responded that they were bringing "civilization" to their backward peoples. Both somewhat class-like attitudes continue today. The Palestinian cause is decidedly proletarian in its tone, seeing its oppressor as an exploiting and colonial Israel – backed up by American imperialism; while Israelis (and then Americans) claim they are defending civilization against primitive terrorists. In the particular circumstances explained in the rest of my theses, such sentiments might generate murderous ethnic cleansing.

Thus ethnic differences cannot be understood in isolation from other social differences – especially of class, region and gender. In fact ethno-nationalism is strongest where it can "capture" class, regional and gender sentiments. The most serious defect of recent writing on ethnic nationalism has been its almost complete neglect of class relations.[3] This simply inverts the defect of a previous era in which class conflict was believed to dominate while ethnicity was ignored. Now the reverse is true, and not only among scholars. Our televisions are nowadays alive to the sight and sound of ethnic/ religious strife, but not to the clashes between workers, peasants, capitalists and landlords across the world (though these are probably more frequent

---

[3] In Anthony Smith's (2001) recent review of theories of nationalism, class (and region and gender) are largely absent from his pages (cf also Hutchinson,1994; Brubaker, 1992, 1996). Marxian analyzes of particular classes being the bearers of nationalism form an exception to this neglect, though Marxists seem not to have discussed ethnic cleansing, preferring to expose class forms of exploitation! Some writers view class and ethnicity as polar opposites, claiming that class is "materialistic", ethnicity is "emotional" (Horowitz, 1985: 105-35; Connor, 1994: 144-64). This is incorrect: class conflict can be highly emotional and ethnic conflict very material.

than ethnic clashes). But the bigger point is that these two types of conflict infuse each other. Palestinians believe they are being materially exploited. To neglect either ethnicity or class is mistaken. They are partly opposed, but partly entwined, principles of stratification. In most societies both are important but their tensions are processed quite peacefully. In a few societies one or the other may come to dominate. But such domination always involves the "capturing" and "channeling" of the other – and the process is never merely one-way. The same can be said of gender and regional sentiments.

Thus we **never** find murderous cleansing among rival ethnic groups who are "separate but equal". Mere difference is not enough to generate much conflict. It is not "Christians against Muslims" which causes problems, but contexts in which Muslims feel oppressed by Christians (or vice-versa). After all, if South African apartheid had actually lived up to its own ideology of involving "separate but equal" development between the races, Africans would never have revolted. They revolted against the fact that apartheid was a sham, actually involving racial exploitation of Africans by whites. For serious ethnic conflict to develop, one ethnic group must exploit or threaten to exploit the other – or at least, this notion must have substantial plausibility to the "exploited". And in turn the imperial "oppressor" will react in righteous outrage against the "threat" of having its "civilization" overwhelmed by "primitivism" – just as upper classes do when threatened with revolution. My case studies are extreme examples of ethnic "success", where class and other stratification axes are largely "captured" and "channelled" by ethno-nationalism. But this is unusual and must be carefully explained, and contrasted with cases where this does not happen.

We will see three main ways in which class sentiments are "captured" and "channelled" by ethnicity. These involve in turn ideological, economic and military power relations.

(2a) A **shared religion** may partially transcend class. This produces the shared ideology that all possess the same soul, and entire communities can be integrated through the intimate family rituals provided by religions. In certain circumstances Muslims become mobilized against Hindus in India, Irish Protestants become mobilized against Irish Catholics. We will see this happening historically in Europe, and in Chapter 16 across the "fault-lines" between today's world religions. But on its own this is the weakest of the four types of capture. Class, region etc. may be temporarily muted by religion, but they are very rarely transcended. Hindu politics remain dominated by class and caste issues, even under the rule of supposedly Hindu Nationalist Party. And "combat fundamentalists" within Islam are as much motivated by class resentments against their own Muslim rulers as by resentments against other ethnicities. A religious collective identity only becomes truly dangerous, where political struggles are also involved – where a religious group attempts to capture the state, enforcing their religious conceptions on others. This involves the more political theses listed below.

(2b) Three distinct types of economy may channel material interests and class sentiments into ethnicity. In an **ethnic niche economy**, one ethnic group may dominate certain occupations (Jews may be traders, money-lenders etc), displacing class resentments onto ethnicity. This is the weakest of the three types of economy. On its own, this might produce some riots, even

pogroms, but not worse. This is not the way to explain the "Holocaust", for example. Worse is a **statist economy**, one ethnic group may "possess" the state and its economic patronage, making an ethnic out-group feel like an exploited proletariat. This is a problem in developing countries today. It played a particularly escalating role in the Rwandan genocide. Worst of all is where one ethnic group claims a **land monopoly**, seeking to dispossess the ethnic out-group and threatening its very livelihood. This is the colonial settler pattern, leading to terrible ethnic cleansing. This is easily the worst of the three economic scenarios.

(2c) It is well-known that the worst ethnic cleansing occurs in wartime. **War mobilization** allows the state to penetrate deeply into the national society and the local community. National solidarity tends to envelop and mute class, regional and gender differences. However, the distinction between the "front" and the "rear" mean this remains incomplete. Other identities beside ethnicity are maintained in the rear. World War II will be my main example. But explicitly **ethnic civil wars** are obviously much worse. They pit one ethnic group against another, producing massive mobilization of ethnic identities. Front and rear dissolve into one. Everyone is forced into a single ethnic identity transcending class and other axes of stratification. This happened in Yugoslavia and Rwanda in the early 1990s, and in Afghanistan in the late 1990s as civil war rivals became increasingly ethnic, involving mass murder of the rival ethnic tribes. But here we must explain how wars come to entangle ethnicity – which I take further in my fifth thesis.

In the countries on which I focus in this book, several of these forces typically operate simultaneously or sequentially. They may culminate in murderous cleansing, or they may erupt only to then fade away. This depends on the forces identified in my remaining theses.

(3) **The "danger zone" of murderous cleansing is reached when (a) large movements claiming to represent two fairly "old" ethnic groups have both persistently laid claim to "their own" state over all or part of the same territory; and (b) this claim seems to them to have substantial legitimacy and some plausible chance of being implemented.** Dangerous cases involve the overlaying of rival claims to political sovereignty on top of quite "old" senses of ethnic difference – though not on what are generally called "ancient hatreds". Ethnic differences are worsened to serious hatreds, and to "dangerous" levels of cleansing, by persistent rival claims to political sovereignty. If we distinguish four major sources of power in societies, then murderous ethnic conflict concerns primarily **political power relations**, though as it develops it also involves ideological, economic and finally military power relations too. Mine is essentially a political explanation of ethnic cleansing.

(4) **The "brink" of murderous cleansing is reached when one of two alternative scenarios plays out. (4a): the less powerful side is bolstered to fight rather than to submit** (for submission would normally reduce the deadliness of the conflict) **by believing that aid will be forthcoming from outside** – usually from a neighbouring state, perhaps its "ethnic homeland". In this scenario both sides are laying political claim to the same territory, and both believe they have the resources to achieve it. This was so in the Yugoslav, Rwandan, Kashmiri and Chechen

cases, for example. In the second scenario, **(4b), the stronger side believes it has such overwhelming military power and ideological legitimacy that it can achieve its own cleansed state violently at little physical or moral risk to itself.** (4b) approximates to the most serious "colonial settler" cases, as in the North American, Australian and Circassian cases considered later. The Armenian and Jewish cases mixed these two scenarios together, since the dominant Turkish and German sides believed they had to strike first in order to prevent the weaker Armenian and Jewish sides from allying with far more threatening outsiders. Right now a few Israeli extremists are being tempted toward a similar solution to the Palestinian issue. All these terrible eventualities were produced by interaction between the two sides. We cannot explain such escalation in terms merely of the actions or beliefs of the perpetrators. We need to examine the interactions between the "perpetrator" and "victim" groups -- and usually with other groups as well.

(5) **"Going over the brink" into the perpetration of murderous cleansing occurs where the state exercising sovereignty over the contested territory has been factionalized and radicalized amid an unstable geopolitical environment leading into war**. Out of such political and geopolitical crises "radicals" emerge calling for "tougher" treatment of perceived ethnic enemies. In fact, where ethnic conflict between rival groups is quite "old", it is usually somewhat ritualized, cyclical and manageable. Truly murderous cleansing, in contrast, is unexpected, originally unintended. It emerges out of crises concerning other matters. War is the most serious crisis, one that effects a temporary transcendence of class. The converse of this thesis is that in cases where states and their geopolitics remain stable, even severe ethnic tensions and violence tend to be cyclical and manageable at moderate levels of violence below that of massive murderous cleansing. As we see in Chapter 16, present-day India has long remained in the "danger zone" by virtue of rival political claims expressed by Hindus, Muslims, Sikhs and others. Yet since 1950 almost never has this toppled over into massively murderous cleansing, because India offers a basic level of political and geopolitical stability in which the politics of class and caste help undercut ethnic solidarity. But where political institutions are unstable and affected by war, violence may lead over the precipice into mass murder.

The forms of political instability vary, however. Some states were fragmenting and factionalizing (like the Hutu state of Rwanda), others had been seized and being newly consolidated, determinedly repressing dissidents and factionalism (like the Nazi state). In some brand-new states, consolidation was occurring in contradictory ways in different parts of the state (as in the new Bosnian and Croatian states). But the essential point is that these were not stable and cohesive states, of either democratic or authoritarian types. Nor were they the "failed" states that political science researchers have shown are most likely to generate civil wars. Ethnic cleansings are in their most murderous phases directed by states, and this requires some state coherence and capacity.

(6) **Murderous cleansing is rarely the initial intent of perpetrators.** This is also quite surprising. It is very rare to find evil geniuses plotting mass murder from the very beginning. Not even Hitler did so. Murderous cleansing typically emerges as a kind of "Plan C", developed only after the first two responses to a perceived ethnic threat fail. Plan A typically envisages a

carefully planned solution in terms of either compromise or straightforward repression. Plan B is a more radically repressive adaptation to the failure of Plan A, more hastily conceived amidst rising violence and some political destabilization. When these both fail, some of the planners radicalize further. To understand the outcome, we must analyze the unintended consequences of a series of interactions yielding escalation. These successive Plans may contain both "logical" and more contingent escalations. The perpetrators may be ideologically determined from quite early on to rid themselves of the ethnic out-group, and when milder methods are frustrated, they almost logically seem to escalate with resolute determination to overcome all obstacles by more and more radical means. This was true of Hitler and his Myrmidons: "The Final Solution of the Jewish Question" seems much less of an accident than the logical escalation of an ideology ruthlessly overcoming all obstacles in its path. For the Young Turks, however, the "final solution" to the Armenian problem seems much more contingent, flowing out of what they saw as their suddenly desperate situation in 1915. For Rwandan Hutus we find elements of both: an inner core of north-western Hutu Power radicals exploiting crisis in pursuit of their radical ideological goal, and far more Hutus brought more contingently into genocide by the crisis of 1994.

To downplay intentionality like this is morally uncomfortable. It usually involves me in arguing against many who speak in the name of the victims. Some may claim that my position is akin to "denialism". It is not. Genocide of the Jews, the Armenians, the Tutsis, of some colonized native peoples and of others was deliberately attempted and mostly accomplished. The evidence is overwhelming. But many who speak for the Jews, Armenians, Tutsis etc like to emphasize the premeditation of their oppressors. This probably derives less from the understandable hatred they bear them, than from their need to find "meaning" in the sufferings of their people. What could be worse than to regard such extreme suffering among our loved ones as merely an accident? In King Lear, Edgar says of his sufferings "Like flies to wanton boys are we to the gods". I find that a tempting theory of human society, but I doubt many victims do. I am not actually arguing that murderous cleansing is accidental, only that it is far more complex and contingent than blame-centred theories allow. It is eventually perpetrated deliberately, but the route to deliberation is usually a circuitous one.

There are many evil people striding across the pages of this book. Yet to understand the perpetrators, we must refine our conceptions of "evil". We will find very few people who are in some original sense "evil" in character. Instead they are "radicalized" into evil by varying combinations of ideology and unanticipated power interactions in crises. These differences show up in the spirit in which they finally commit evil. Where driven mainly by contingencies, they become panicky and desperate. The culminating violence offers "success" in ridding them of the perceived threat, giving a sense of release, freedom and elated triumph which emotionally shields the perpetrator from recognition of evil. This seems to have been true of many Young Turks in 1915. Where driven more by ideology, perpetrators are different, exhibiting a more ruthless rigour, grim acceptance that evil must be endured for the sake of a greater goal and "good". This is how most of the leading Nazis thought. As ghastly as are their deeds, we must try to understand their psychology. But understanding does not mean excusing.

(7) **There are three main levels of perpetrator: (a) the radical elites running "party-states"; (b) bands of militants forming violent "paramilitaries"; and (c) "core constituencies" providing mass though not majority popular support.** Elites, militants and "core constituencies" are all normally necessary for murderous cleansing to ensue. We cannot simply blame malevolent leaders or ethnic groups en masse. That would be to credit leaders with truly magical powers of manipulation, or whole peoples with truly remarkable single-mindedness. Both assumptions are at odds with everything sociologists know about the nature of human societies. In all my cases particular elites, militants and core constituencies are linked together in quite complex ways, forming social movements which (like other social movements) embodies mundane power relations. Power is exercised in three distinct ways: "top-down" by elites, "bottom-up" by popular pressures, and "coercively sideways" by paramilitaries. These pressures interact and so generate mundane relations found in all social movements – especially of hierarchy, comradeship and career. This has a big impact on perpetrator motives, as we see in a moment.

The notion of "core constituencies" makes explicit what should be an obvious point: in situations of ethnic conflict. Murderous cleansing resonates as a possible solution to tensions more in some social environments than others. I will show that it resonates more within constituencies favouring some combination of extreme nationalism, extreme "statism" and violence. This means that the principal core constituencies of murderous ethnic cleansing identified in this book are:

(a) ethnic refugees and people from "threatened" border districts;
(b) those more dependent on the state for their subsistence and values;
(c) those living and working outside of the main sectors of the economy which generate class conflict (who are more likely to favour class over ethno-nationalist models of conflict);
(d) those socialized into acceptance of physical violence as a way of solving social problems or achieving personal advancement – like soldiers, policemen, criminals, hooligans and athletes;
(e) those attracted to machismo ideology – young males striving to assert themselves in the world, often led by older males who were socialized as youths in an earlier phase of violence.

This means that the main axes of stratification involved in cleansing movements are region, economic sector, gender and age. Class is not usually directly involved, for it has been trumped. (though it is indirectly involved through the rechanneling of class resentments onto ethnicity). Thus radical ethno-nationalist movements – unlike nationalism in general – tend to contain a "normal" class structure: leaders come from the upper and middle classes, the rank-and-file from lower down – with the real dirty work often performed by the lumpen proletariat. I explore all these groups' motivations, careers and interactions. Core constituencies give to core perpetrators distinctive value-driven motives, involving ideology and sub-cultural norms.

(8) However, when we consider the total body of perpetrators, we find them driven by much more varied motives, indeed by the range of motives to which we "ordinary people" are subject when we participate in social life. Thus **"ordinary people" are brought by "normal" social structures into committing murderous ethnic cleansing .** To understand ethnic cleansing, we

need a sociology of power more than a special psychology of perpetrators as disturbed or psychotic people – though some may be such. The psychologist Charny (1986: 144) correctly observes "the mass killers of humankind are largely everyday human beings -- what we have called normal people according to currently accepted definitions by the mental health profession."

If I have learned one thing from my research, it is that, placed in comparable situations and similar social constituencies, you or I might also commit murderous ethnic cleansing. No people is invulnerable. Many Americans and Australians used to commit murderous cleansing; some Jews and Armenians – the most victimized peoples of the 20th century – have perpetrated recent atrocities against Palestinians and Azeris (and in turn these "victims" are also perpetrators). There are no virtuous peoples. There is a powerful religious view which stresses the presence in all humans of "original sin", the human capacity for evil. Indeed, placed in the" right" circumstances and core constituencies, we are almost all capable of such evil -- perhaps even of "enjoying" it. But "original sin" would be an insufficient explanation for this, since our capacity for evil only becomes realized in the circumstances explored in this book. In the case of cleansing, these circumstances are less primitive or ancient than modern. There is something in modernity releasing this particular evil on a mass scale. This book explores exactly what this is.

These eight theses are not entirely my own creation. In developing them I have drawn much from previous writers. But stated so baldly, all at once, they may seem contentious and overly schematic. Given the messiness and uniqueness of societies, they cannot be scientific laws. They do not even fit perfectly all my case-studies. For example, the Nazi genocide of the Jews does not fit neatly into thesis (3) above, since Jews were not claiming sovereignty over any part of Germany. In Chapter 7 I offer a modified, "indirect" version of thesis (3) in which Jews seemed to German radical nationalists to be implicated as conspirators in other groups' claims to political sovereignty (especially as so-called "Judeo-Bolsheviks"). In the case of the US genocide of the Indians, the state does not fit very well into my thesis (5), since the US government was fairly cohesive and stably democratic (for whites) – though things were more fluid on the frontier zones where the mayhem was actually committed. In each case I will investigate the extent to which these theses apply, pointing out differences and modifications necessary. My theses provide a broad explanatory framework, not a covering law. They can certainly help us look for more danger zones in the world today – as I hope to show in Chapter 17.

I explain and document my theses at length through the book. Chapter 2 will give a critical discussion of previous theories of ethnic conflict and cleansing, noting their strengths and weaknesses. If you are more comfortable with narrative than analysis, skip it and go to my history of cleansing. Chapters 3 and 4 outline a brief history of cleansing from ancient to modern times, showing how ethnic cleansing was originally quite rare in history (as stated in theses (1) and (2)) but then became endemic in the world of the Europeans, at first in rather mild ways which remained subordinate to class conflict. Mass murder has been ubiquitous through most of human history, a general if uncommon part of the human social condition. But murder in order to **remove** ("cleanse") a people was rare in earlier centuries. Ancient Empires might extend the

"exemplary repression" of a particularly troublesome people into murdering many men of fighting age or deporting in order to disperse part of a troublesome people (as the Assyrians did). But conquerors had no interest in wiping out ethnic identities, because they wanted to use the labour of conquered peoples and they themselves usually lacked much of an ethnic identity – or at least one that transcended class. The main exceptions were therefore settler-conquerors like the Huns or the Anglo-Saxons, relatively classless peoples moving in to occupy and graze or work the land themselves, without need of native labour. Their cleansing may have resembled that inflicted by European settler-colonists on the indigenous peoples of the New World in the early modern period (discussed in Chapter 5). These were the main and rather rare occasions in which ethnicity might trump class in earlier times.

Yet the rise of mass salvation religions open to all the classes – like Judaism, Christianity or Islam – brought some class levelling, of the ideological soul though not of economic or political power. The first serious European cleansing was religious, of heretics, Jews and Muslims. Later it appeared between Catholics and Protestants. By modern standards, however, this cleansing was fairly mild. Death-rates turn out to be much lower than is often popularly supposed in historical memories of such events as the Albigensian Crusade, the expulsion of the Jews and Moors from Spain, or Cromwell's campaigns in Ireland. When confronted with the most extreme choice of the period, convert or die, most chose conversion – and lived. The religious wars settled, Europe then underwent a long process of rather mild cleansing of minority language cultures. This did not transcend class, since it proceeded class by class. First the Welsh gentry were part-persuaded, part-compelled to adopt English, then the Welsh middle class, then the Welsh peasantry and working class.

This class-by-class process then interacted with the rise of rule by "we, the people", that is with representative democracy of the liberal kind. But "the people" was also initially class- (and gender-) bound – it only meant "men of property". Liberal democracy did not transcend class, it institutionalized class differences politically. As its conception of "the people" was plural, tolerating class differences, it also tolerated ethnic differences. The liberal regimes of northwestern Europe have not practiced murderous ethnic cleansing. But things were different in eastern and southeastern Europe. Their struggle for rule by "we, the people" came later, and by the late 19th century it really did mean "all the [male] people", not just the propertied classes. Their struggle was directed against the three great multi-ethnic Empires, Romanov, Habsburg and Ottoman. The *demos* was also the ***ethnos***, in opposition to their foreign imperial oppressors. In this struggle for democracy, where peoples could be defined ethnically, the threat of murderous cleansing arose. Democracy and the nation were seen as "organic", possessing a singular identity and soul. Croatia, Serbia, Poland, Romania etc were viewed as the state of the Croats, Serbs, Poles and Romanians – and not of others. Now ethnicity was potentially trumping class and my remaining ethnic theses might come into play.

The empirical core of the book then consists of a series of studies of the worst outbursts of modern murderous cleansing. In all of them I go from the most general causes of "danger zones" to the events which precipitated "going over the brink" to the actual processes and perpetrators of murderous cleansing. I begin in Chapter 5 with some colonial cases, the murderous cleansing

of native peoples from Central and North America, Australia and South West Africa by European settler colonists. I stress their ferocity and argue that relatively egalitarian and relatively democratic groups of settlers were the most ferocious. This was the most direct dark-side of democracy we shall find in this book, where impeccably democratic regimes (for whites) committed ethnic mayhem, and where politicians had to support it to get democratically re-elected.

Chapters 6 and 7 then deal with the first 20th century genocide, launched in 1915 against the Armenian population of the Ottoman Turkish Empire. This has to be seen in the context of the prior murderous cleansing by Christians of Muslims in the Balkans and the Caucasus. Chapters 8 to 11 form the lengthiest case. They deal with the worst case of all, the genocides attempted by Nazis and allies during World War II. Chapters 9 and 10 report on a substantial piece of primary research done for this book, an analysis of the biographies of 1581 Nazi war criminals undertaken to show who they were and why they committed their evil deeds. Chapter 12 then examines a rather contrasting set of cases, the rather different cleansings committed by communist regimes, which have targeted classes more than ethnic groups as victims. Chapters 13 and 14 discuss murderous cleansing begun in the 1990s in the republics of the former Yugoslavia, and still continuing. Chapters 15 and 16 treat the most recent genocide, committed in the Central African Republics of Rwanda and Burundi, exploding during the 1990s. There the murders also continue today.

My analysis must also confront two difficulties of method. First, small numbers. Mass murderous cleansing is fortunately rare. How can we generalize about such few cases? Might not the causes of murderous cleansing be unique to each case? To some extent this is true. Nazis and their hatred for Jews were unique. So is the situation of Tutsis and Hutus in Rwanda, living right amongst each other across the whole country, unable to withdraw to their own core territories. All my cases have peculiarities which I must respect. That is why I deal with them at some length. Second, to consider only these cases would be to consider only cases which do escalate to mass murder, ignoring the more numerous cases where ethnic tensions get successfully defused (this would carry the defect of "sampling on the dependent variable", as sociologists say). So my Chapter 17 examines contemporary India and Indonesia which both contain ethnic rivalries which lead on to varying degrees of violence. What accounts for the differences between these cases? Finally Chapter 18 surveys broader trends in the world today. It sees a broadly pacified "North" of the world as a large zone in which ethnic cleansing, sometimes murderous, more often not, is largely a thing of the past, creating the various nation-states into which it is now divided. It sees the "South" as containing far more ethnically diverse states. Among them are two main zones of concern. The first is a number of scattered "black holes" of desperate conflict, mostly located in rather impoverished countries, some on the fringes of larger "imperial" Southern states. The second are broader "fault-lines" where religiously based conflict surfaces, with "combat fundamentalism" becoming the most violent. These all concern conflict between local groups, but some of them become much broader because they also express conflicts between Northern "imperialism" and an "exploited" South. The Chapter concludes by asking how we might avert murderous cleansing in the future. I will argue that success in this venture is the **only** way to prevent re-occurrences of atrocities like those of September 11, since mere

military or security measures will generate more Southern "proletarian" resentment, and more, not fewer, terrorists.

But obviously I need to first define some terms. What exactly is an "ethnic group"? What is "ethnic cleansing"? How does cleansing relate to violence and murder?

Concepts: Ethnicity, Nation, Ethnic Cleansing

Ethnicity is not "objective". Ethnic groups are normally defined as groups sharing a common culture and common descent. Yet neither criterion is entirely clear. Culture is vague and descent usually fictitious. A common culture may refer to a relatively precise characteristic, like a shared religion or language. But it may merely refer to the group's claim that it shares a "way of life" -- which cannot be precisely defined. As for common descent, it is mythical for any group larger than a clan or a lineage inhabiting a fairly small area (what I shall call a "micro-ethnicity"). The future use of DNA analysis will probably reveal that relatively immobile populations share substantial common heredity, but this will not be so of most large groups claiming ethnic commonality. People who define themselves as Serbs or Germans or Scots actually descend from many smaller descent groups who have moved around and intermarried with their neighbours. Thus claims to commonality among large groups actually aggregate together numerous descent groups ("micro-ethnicities"). This book is concerned with these "macro-ethnicities", formed by social relations other than biology or kinship. None of the ethnic conflicts considered here are truly "natural" or "primordial". Ethnic groups and their conflicts are socially created.

They are created in diverse ways. A common language is important in uniting Germans, but not Serbs (for their language is shared with Croats and others). Religion is important for Serbs (their orthodox Christianity distinguishes them from Croats, Bosniaks and Albanians), but not Germans (divided into Catholics and Protestants). Ideological theories of "civilization" and "race" also helped give Europeans a common sense of being "civilized" and "white". Economic exploitation is often important, as noted above. Military power is important in creating macro-identities, especially among the defeated. Imperial conquerors often create macro-ethnicities by allocating particular economic, political or military roles to persons they define as belonging to a single "people" or "tribe". Finally, political power relations in the sense of a shared political history (as independent state or distinct province) is of ubiquitous importance – as it is for Scots, not distinct in language or religion from the English but with a distinct political history. Given this diversity, it is safer to define ethnicities subjectively, in terms they themselves and/or their neighbours use.
An **ethnicity** is a group which defines itself or is defined by others as sharing common descent and culture.

Ethnic cleansing is the removal by members of a self-identifying ethnic group of those they consider an ethnic out-group from a community they define as their own.

The **nation** adds more political power content to ethnicity. A nation is a self-defined ethnic

group which also has political consciousness. That is, a nation defines itself as sharing a common culture and history (a weaker version of "descent") which claims collective political rights in a given territory.

Finally, a **nation-state** results where such collective political rights are possessed by "its own" sovereign state. Not all self-conscious nations possess or desire nation-states. Some "nations" claim only local autonomy or entrenched rights within a broader multi-ethnic state. We will see that ethnic cleansing emerged when modern nations and nation-states were overlaid on top of macro-ethnic groups.

Yet ethnic groups treat each other in many varied ways, most of which do not involve murder. Since the advent of global news media, the few cases involving mass murder are imprinted upon our consciousness. But thankfully they are rare. In the continent of Africa the outbreaks of mass killings between Hutus and Tutsis made it into the world's media. We may believe this to be typical of Africa, which figures mostly in the Western media only for really bad news. But the Hutu/Tutsi conflict is one of only a handful of African cases of murderous ethnic cleansing -- in a continent in which all states are multi-ethnic. Fearon & Laitin (1996) estimate all the cases of serious ethnic violence as well under 1% of all the multi-ethnic environments found in Africa. So murderous cleansing is only one of many types of ethnic relationships.

Table 1.1 copes with this variety by identifying degrees of both violence and cleansing in ethnic relations, enabling us to distinguish murderous ethnic cleansing from non-murderous "cleansing", as well as from outbreaks of mass violence and killing whose purpose is not to ethnically cleanse.

TABLE 1.1

This Table contains two dimensions: the extent to which a group is eliminated ("cleansed") from a community and the extent to which violence is used to achieve it. Remember that since ethnic groups are culturally defined, they can be eliminated if their culture disappears, even if there is no physical removal of persons. People can change their cultural identity. But I shall not fly in the face of normal understandings of the term ethnic cleansing to include mere cultural elimination in the category, except by placing inverted commas around the word cleansing in such cases -- as I do in this Table. But I must discuss non-violent ethnic "cleansing" alongside violent and murderous ethnic cleansing, since I wish to see in what circumstances murder is chosen.

The terms I now introduce from this table will be used throughout this book. The first Row of Table 1 begins with the nicest policies, those which contain no significant violence. Row 1 Column 1 involves the ideal way to solve relations between ethnic groups, through equal treatment and respect shown to all ethnic groups. This is **Multi-Culturalism.** Some multi-cultural states simply ignore ethnicity, treating all persons as equal regardless of their ethnicity. Their constitutions do not mention the rights of ethnic groups, while political parties and social movements (apart from cultural ones) do not organize around ethnicities. This is a common ideal

in countries of ethnically plural immigration, like the US or Australia. Since such immigrant groups cannot plausibly claim their own state, they present no threat to the existing state, and the constitution can safely ignore their ethnicity. Thus many people in the United States and Australia aspire to a culture which is multi-cultural but to a polity which is ethnically-blind. Their politics would then concern class, region, gender etc more than ethnicity.

Things differ in the more potentially dangerous situation in which ethnic groups dominate distinct territories or can otherwise aspire to create their own states or regional autonomies. Multi-cultural ideals here have difficulty in remaining ethnically-blind in the political arena. They do not ignore ethnicity but explicitly build it into constitutions through collective guarantees for different ethnicities. This might be through **Confederal** methods (ethnicities have a degree of regional control, as in contemporary Nigeria) or **Consociational** methods (they are guaranteed power-sharing at the centre, as in Belgium). Such entrenchments are aimed at binding all major groups into the state. Here politics will concern ethnicity as well as class etc., but hopefully they will be the politics of ethnic compromise. "Affirmative action" programmes are a much milder, liberal version of this which only guarantee protections at the individual level for out-groups. **Toleration** is a weaker and more common version of recognizing the reality of multi-culturalism. “Toleration” implies that we have feelings of hostility toward the out-group but are trying hard to suppress them.

This group of ethnic policies contain those to which most of us across the world aspire. Unfortunately, they are mostly ideal, not real-world polities. Communities and their states are usually less tolerant than this.

The next two columns of Row 1 include cases where ethnic groups weaken or disappear without violence. They are partially or totally “cleansed” -- but by consent. This happened in the later phase of ethnic homogenization in Western Europe. By the mid-19th century in France or Britain, their states needed apply little coercion to eliminate minority languages. Minorities accepted that their own regional language – say Breton or Welsh – was “backward”, depriving their children of success in modern society. Most immigrants to the US or Australia similarly acquire English voluntarily, do not teach their children their own original language and abandon many other ethnic cultural practices. Their descendants may retain only a sentimental sense of being “Germans”, “Slovaks” or “Welsh”. The Welsh Congregational Church in Los Angeles erupts in cheering at the minister’s news that Wales have just beaten England at rugby -- even though virtually none of these Americans have seen, let alone played, the Welsh national game. Of course, some more significant ethnic practices exist in the US, like Irish or Italian political machines, or Catholic Irish-American financing NORAID, a front organization raising arms for the IRA. So **Voluntary Assimilation** produces a “cleansed” society, not from hostile acts by the dominant group but by positive inducements. White immigrant groups in the U.S. or Australia have lost most of their earlier ethnic identity as they pursued economic and status success and social conformity and became Americans or Australians. This is a pretty harmless and marginal form of “cleansing”, lamented only by those who value the preservation of traditional cultures. Indeed, you may find the word “cleansing” (even inside its inverted commas) to be inappropriate here. The result of assimilation if that class and other axes of stratification dominate politics, not

ethnicity.

Row 2 contains the first escalation of violence, to types of **Institutional Coercion**. Column 1 contains **Discrimination,** probably the most common inter-ethnic policy of all. It limits the rights of the out-group but permits its members to live amongst us and retain their ethnic identity. Discrimination typically involves preferential hiring, “red-lining” residential districts for different housing policies, negative cultural stereotyping, offensive inter-personal behaviour and police harassment. Most countries discriminate against some minorities. African Americans still suffer dsicrimination, one hundred and fifty years after the abolition of slavery, fifty years after the Civil Rights Movement. The criminal offence sardonically described in the US as “Driving While Black”, where the cop pulls over a black man because he is driving “too good” a car, is a good example of current harassment. All such discrimination is to be deplored and fought against, but it is a lot better than what follows in the rest of this table.

At its worst, though, discrimination can be quite severe, restricting rights to acquire education, the vote, public office or property ownership. Alternatively, the dominant group may institutionally compel out-groups to use its language as the official one of education and the public sphere. This normally involves partial cultural “cleansing”, since out-groups retain their own languages for the private sphere. **Segregation** is the geographical version of partial “cleansing”: The out-group is permitted to live in society, but in ghettoized, apartheid or enslaved conditions. Here not the society as a whole but some part of it is cleansed. This may be far more oppressive than the milder forms of total “cleansing”. After all, many slaves would like to run away from their oppression (which would produce a more “cleansed” society) but are prevented by force from doing so. Here ethnic and class politics continue alongside each other. Apartheid South Africa had almost “normal” class politics within its white community, and some traces of them within its African and coloured communities, but race dominated politics as a whole.

The next column, **Cultural Suppression,** involves total cleansing, though only through institutional coercion. Public institutions suppress the culture of the out-group whose identity is thus forcibly assimilated into the dominant group. The group’s language may be banned from schools or offices, its religion banned, its distinctive family names changed by law. Though this is coercive, it usually “legal” and involves little physical force, except to put down scattered resistance to the policy (which the next Row covers). Such suppression is not often viewed as "ethnic cleansing", especially if it is successfully imposed. Then, after the passage of some time, it may not be generally remembered by either group as cleansing -- as, for example, with the assimilation of Welsh people into a British identity largely defined by the English. Welsh people are generally proud of what Welshness they believe they have retained, not the probably larger cultural traits they have lost. Another example is the virtual total assimilation of Provencals or Acquitainians into French identity. Many of the out-group may react to all these ill-treatments by emigrating, as the Irish did in such large numbers. This is also a part-coerced, part-voluntary form of “cleansing”**.**

Physical violence begins in Row 3, containing **Selective Policed Repression.** “Selective” means

it is targeted at dissidents, usually protesters against Row 2 policies. "Policed" means repression remains rather orderly, enforcing laws through routinized "legitimate" means -- though this will typically also include some limited physical violence. The first column contains repression aimed specifically at protesters, the second escalates to an attempt to repress part of out-group identity. The latter also contains policed implantation of settlers from the dominant group, displacing the indigenous out group from their homes, though not from the society as a whole. An example would be the settlement of Protestant Scots onto Ulster farms from the 17th century onward, forcibly displacing thousands of Irish Catholic farmers. The third column moves us to **Policed Total Cultural Suppression**, **Population Exchanges**, and **Policed Deportations and Emigrations**, a wide variety of state-run cleansings, coercive but not usually very violent. The policies discussed so far normally involve a fairly stable state believing only that it is enforcing the rule of law.

Row 4 introduces serious physical violence. In the first column this remains routinized and orderly, under state control. **General Policed Repression** is aimed at groups harbouring protesters, rioters, rebels or terrorists, inflicting sanguinary official punishment, in order to cow the main part of the group to submit. If this is routine, states will employ specialized paramilitaries whose names become notorious to out-groups -- like the Cossacks or the Black-and-Tans. The next two columns involve less controlled violence. Escalation to violent partial cleansing involves settlement/ displacement, as in most European colonizations, and "**Pogroms**" and communal riots, varied short-lived forms of violence, including rioting, looting, plus some murder and rape, with mixed motives -- state agencies seek to displace political tensions onto out-groups, locals enjoy the looting, violence and rape, ethnic cleansers try to induce terrorized flight. Pogroms typically induce some emigration. Common victims have been the Jewish, Armenian and Chinese diasporas. The next escalation is to **"Wild" Deportations** and **Emigrations**, involving enough brutality to persuade members of the out-group to flee -- as in the former Yugoslavia in recent years. Cleansing of a more "racial" form may involve distinctively **Biological** policies. Here the out-group is denied reproduction by restrictive marriage or sexual policies, escalating perhaps to forcible sterilization or to rape where the intent is to make the woman unlikely to bear children carrying the identity of the out-group. Biological cleansing tends to centre on females, for obvious reasons -- maternity is certain, paternity only presumed.

Row 5 escalates to the violence of mass deaths which were the unintended consequence of the dominant group's policies. The first column involves policy "**Mistakes**", often through submitting ethnic groups to labour conditions to which they were ill-adapted, or by revolutionaries seeking to achieve major social transformations with foolish policies -- for example, the "Great Leap Forward" in China, which unintentionally killed millions. The implication is that once the mistake is realized, the policy will be abandoned, and so the out-group will not be wiped out. I do not wish to "exonerate" the perpetrators of such mass killings, for the numbers of the dead may be enormous. Most big "mistakes" border on the next category, labelled as **Callous** policies. These are not directly intended to kill the out-group but the dominant group has such negative views of the out-group that it does not particularly care that this ensues. This is not quite true of the leadership of the Great Leap Forward, but their slowness

in reacting to disaster obviously did reveal a relative lack of concern for the lives of the victims. Wars and civil wars loom large in the callous category, especially in the devastation inflicted on civilian populations through “laying waste to the country” or bombing cities. Stalin’s famine-inducing policies among peasants and Ukrainians or the “Highland Clearances” of Scotland are other examples. The limiting case is the very first colonization of Caribbean islands by the Spanish. By the time the colonialists collectively realized what their impact on the natives was, virtually all the natives were dead, which makes this strictly “ethnocide”.

Ethnocide refers to a wiping out of a group and its culture which is not wholly intended by the dominant group. This is the exponential escalation of callous practices by the dominant group, which may even welcome the elimination of the out-group when this occurs. Ethnocide characterized the main thrust of many terrible encounters between colonial settlers and indigenous peoples, in which most deaths resulted from diseases carried from the dominant to the out-group, worsened by “reservations” and terrible labour conditions which were not intended to kill, but which did wear down the natives to near death. Much more of this in Chapter 5.

Finally, Row 6 contains premeditated mass killing. I have excluded killings normally legitimated by the rules of war (ie of defined combatants only) and isolated serial killing committed by a single individual covered by the ordinary criminal code.[4] **Exemplary Repression** is how I style most of the more atrocious imperial conquest policies of history -- for example, putting an entire city to the sword in order to cow other cities into submission. 20th century military campaigns have escalated this type in the form of indiscriminate bombing of civilians, as in Dresden, Tokyo and Hiroshima. This is claimed as being likely to induce surrender, though Dresden and Tokyo also embodied motives of revenge. Modern campaigns also have variants of the Roman practice of decimation (killing every tenth person of a rebellious population). In the Balkans in the 1940s the German army killed fifty local civilians for every German killed by guerillas. These atrocities tend to be officially sanctioned, though more local massacres, like those of some Waffen-SS units or the American soldiers at My Lai, were not. Rebels and terrorists are usually capable of only smaller atrocities of this type, though September 11 was a very large one. This was presumably the first atrocity in a series aimed at American civilians to force American withdrawal from contested parts of the world. Today, all exemplary repression could be theoretically prosecuted under international law as “war crimes” or “crimes against humanity” -- though killers who win wars are rarely prosecuted (only the losers were after 1945). Civil wars also often involve substantial slaughter of the civilian population, with motives of anger, revenge, sadism etc. which usually fall short of systematic

---

[4] Of course, since the rules of war are often vague, and since modern war does kill more civilians, there are many borderline cases. Was the sudden Japanese onslaught on Pearl Harbor, before war has been declared, in this category? Is the US justified in launching missiles and bombs with a known “circular error probability” (ie some will go off-course) against a country harboring its enemy (rather than attempting negotiation for his handover)? Most American say yes, many from other countries say no.

cleansing intent -- e.g. various episodes in the Biafran or Sudanese civil wars.

Then come mass murders whose intent is partial cleansing. **Forced Conversion** is a religious sub-type where there is simple and stark choice: “convert or die”. Serbs were told by Croat Ustasha forces during World War II: become Catholic or die. In pogroms, Jews were often given such a choice. Some of the out-group are killed, either because they resist or because perpetrators wish to show that the choice is for real. But most will live, cleansed partially -- of their religion but not their entire culture.

Politicide is a recently-coined term. It is killing where the intended target is the entire leadership and potential leadership class of a more generally victimized and feared group (as defined by Harff and Gurr, 1988: 360). This may overlap with exemplary repression, though politicide has a more cleansing intent. Wiping out leaders and intellectuals is intended to undermine the out-group’s cultural identity, whereas cities cowed into submission through exemplary repression may retain their identities. By killing all educated Poles, the Nazis intended to wipe out Polish cultural identity, just as Burundian Tutsis intended to wipe out Hutu cultural identity in killing educated Hutus.

Since this book compares cleansing of ethnic with other groups, I add my own coined term, **Classicide**, referring to the intended mass killing of entire social classes by modern leftists. Since this may be more murderous than forced conversion or politicide, I have arrowed it in the table towards, but not in, the genocide category. The Khmer Rouge were the worst perpetrators; Stalinists and Maoists perpetrated short bursts. The victim classes were thought irredeemable enemies. It seems to be distinctive to leftists, since only they are tempted to believe they can do without opposed (“exploiting”) classes. Rightist regimes of capitalists and landlords always recognize that they need workers and peasants to do the work for them. Thus the mass slaughter by the Indonesian army and Islamic paramilitaries of at least 500,000 Indonesian communist sympathizers in 1965-66, though it disproportionately killed poor peasants was targeted at a political rather than a class enemy – at communists. not peasants or workers. It was politicide, not classicide. I discuss classicide in Chapter 12. In revolutionary leftist regimes it has co-existed with “mistakes” and “callousness” amid the Khmer Rouge, Stalinism and Maoism. All three types can be prosecuted as “war crimes” or “crimes against humanity”.

Finally comes **Genocide**, a term invented in 1944 by the Polish lawyer Raphael Lemkin. I begin with the United Nations' definition, which slightly modifies Lemkin’s and is now the international legal definition. The UN says that genocide is a criminal act intended to destroy an ethnic, national or religious group, which is targeted for destruction as such. The U.N. definition can be criticized because it includes both too much and too little. It sometimes may include too much because it adds a sub-clause, allowing either total or “partial” destruction to count as genocide. I have difficulty with the concept of "partial genocide", unless this has a particular geographic connotation. Settlers in California in 1851 attempting to wipe out all the Indians from the Owens Valley were embarked upon partial, in the sense of a local, genocide.

The International Criminal Tribunal for Yugoslavia decided General Krstic had committed a

"partial genocide" in 1995 because his Bosnian Serb troops murdered 7-800 Muslim men in Srebrenica (all those managed to capture). The court decided that, though Muslim women, small children and the elderly were not killed, the massacre of the men meant that the city's Muslim community could not reconstitute itself as a viable community. This was partial genocide of Srebrenica, declared the court (ICTY, Krstic Case, Judgement 2.8.01). I would prefer to term this a local genocidal outburst, set amidst a broader murderous cleansing of Muslims which was too erratic and regionally varied to be termed genocide. On the other hand, I would enlarge the concept of genocide beyond merely ethnic groups -- though not to politically-defined groups, who would be covered by other of my categories (various forms of repression, politicide and classicide). [5] Genocide is also fully intentional, aiming to wipe out an entire group -- though this goal is almost never completely attained. Genocide usually involves not only killings but also the attempt to eradicate cultural memory of the group (destroying its churches, libraries, museums, street names etc.). If only cultural cleansing occurs, I would not call this genocide – in my terms it is cultural suppression -- though UN sources sometimes do. Genocide is committed by majorities against minorities, whereas politicide is the reverse.

This book focuses on the worst ethnic cleansing, the darkly shaded area of the table, collectively labeled "murderous ethnic cleansing".[6] My category excludes all the categories contained in Column 1, even though its lower cells might involve many deaths. I have also coloured three cells adjacent to this dark-shaded area in a lighter hue to acknowledge that these "borderline" zones may also contain some murderous cleansing. I prefer to resist the temptation to call many of these types "genocide" as some do (eg Roger Smith, 1997; Jonassohn, 1998). Genocides are very few -- but they do number more than just "the Holocaust" launched against the Jews (as Bauer, 1997, also notes).

All these categories are what sociologists call "ideal-types", exaggerations of real-world phenomena. Real-world countries typically mix them up together, while the most serious cases tend to escalate rapidly through several of them. There is often debate whether this or that case might count as genocide, so that international law can be invoked. But social behaviour does not

---

[5] Many criticize the U.N. definition for omitting non-ethnic victims, targeted for their political, mental, physical or sexual characteristics (Andreopoulos, 1994: Part I). The Nazis murdered many communists, disabled people and homosexuals. Critics of the U.N. definition are often seeking to get the worst cases of mass murder covered by international law. At the moment, "war crimes" (ie committed in wartime against enemy combattants and civilians) and "genocide" are the most serious offences under international law, whereas "crimes against humanity", which could cover the rest of the more murderous field, remain less clearly defined and are considered "less serious" than genocide by international courts (see Neier, 1998: 12-20, for a brief discussion). My concerns here are neither legal nor political, but analytical – what is the least ambiguous use of terms.

[6] This is roughly the ethnic part of what Rummel in his studies of all large killings calls "democide", killings of the masses.

fall into neat conceptual boxes, whether mine or those of the law. Most cleansing is very mixed. The 95% elimination of North American Indians involved lesser segregations and deportations, escalating to outbursts of exemplary repression, amounting overall to a mostly unintended ethnocide, yet containing repeated genocidal outbursts. South African apartheid mainly combined various types of repression, segregation and coerced deportations (involving 3.5 million people!). The worst cleansings all have earlier less serious phases -- that is how radicals get emboldened and inured. Cleansings typically proceeds in erratic bursts, most of which either die away or produce backlashes. And even genocidal intent by some leaders may get subverted by reluctance or resistance from below -- or vice versa. Most cases of local inter-communal violence do not escalate to mass murder -- as in India, Northern Ireland and most areas of Indonesia.

Making these distinctions reveals two broad but paradoxical features of ethnic cleansing. On the one hand, most has been quite mild. Murderous cleansing is uncommon. Assimilation, backed up by milder institutional coercion, has dominated. On the other hand, most advanced countries today are ethnically "cleansed" since they are substantially mono-ethnic (ie at least 70% of the population considers itself to be of one ethnicity) whereas in the past they were far more multi-ethnic. So we have two main problems. Why did such "cleansing" occur? And why in only a few cases did it turn really nasty? These are the main historical questions which my book must answer.

Table 1.1: Types of Violence and Cleansing in Inter-Group Relations

	Types of Cleansing		
Types of Violence	**None**	**Partial**	**Total**
1. None	**1.Multi-culturalism/ toleration 2. Consociational/ Confederalism**	**Partial abandoning of identity eg thru voluntary official language adoption**	**Voluntary assimilation**
2. Institutional Coercion	**Discrimination**	**1. Official language restrictions 2. Segregation**	**Cultural suppression**

3. Policed Repression	**Selective policed repression**	**1. Policed partial repression of out group language & culture 2. Policed out group settlement/ displacement**	**1. Policed total suppression of language & culture 2. Population exchanges 3. Policed deportations & pressured emigration**
4. Violent Repression	**Generalized Policed repression**	**1. “Pogroms”, communal riots, some forms of rape 2. Violent settlement/ displacement**	**1. “Wild” deportation & emigration 2. Biological: sterilization, forced marriage, some forms of rape**
5. Unpremeditated Mass Deaths	**“Mistaken” war, civil war & revolutionary projects, fratricide**	**“Callous” war, civil war & class war & revolutionary projects**	**Ethnocide**
6. Premeditated Mass Killing	**Exemplary & civil war repression, systematic reprisals**	**1. Forced conversion 2. Politicide 3. Classicide ➜**	**Genocide**

NB: Darker shading indicates the core of the zone of murderous cleansing discussed in this essay; lighter shading indicates a borderline zone in which it may occasionally occur.